پڑھنے والوں کے ہجوم میں دل بن کر دھڑکنے والے بے مثال قلمکار کی ایک اور تخلیق

محی الدین نواب

[illegible]

ہر پوشیدہ چیز انسان کے تجسس کو ہوا دیتی ہے۔ آدمی کی جدت پسند فطرت ہی اسے جہاں تسخیر کرنا چاہتی ہے اور ہر لحظہ انوکھی لذت اور منفرد احساس کی تلاش میں رہتی ہے... لیکن حد سے بڑھا ہوا تجسس آدمی کو شدید مشکلات سے بھی دوچار کر دیتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی کچھ ایسی ہی فطرت کا حامل ہے۔ وہ تعلیم کی غرض سے گاؤں چھوڑ کر شہر آیا تو معصومیت اور سادہ لوحی کی پونجی اس کے پاس وافر تھی۔ اس کا دل اور دماغ کورے کاغذ کی طرح سادہ اور آئینے کی طرح شفاف تھا... درسگاہ میں داخلہ اس کی زندگی میں خطر کا نکتہ آغاز ثابت ہوا۔ وہ شعور و آگہی کے اسباق پڑھ رہا تھا پڑھتا گیا۔ نصاب زندگی کے وہ باب بھی اس کی دراز دستی سے محفوظ نہ رہ سکے جنہیں سیکھنے کے لیے کسی مکتب کی حاجت ہوتی ہے نہ معلم کی ضرورت: وقت انہیں خود ہی تعلیم کرتا ہے... لیکن اس کے پاس انتظار کا وقت نہ تھا کہ وہ سیکھے اور رفتہ رفتہ کے مرحلے میں دیر سے پہنچا تھا۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تجربہ اس کا مطمع نظر تھا۔ بالآخر امتحان کی گھڑی آپہنچی۔ وہ پوری طرح تیار تھا لیکن کامیابی اس کی کم فہمی کے سبب گریزاں تھی... وہی آگہی جو اس نے اپنی تمام تر پونجی کے عوض حاصل کی تھی۔

رشتوں کی بوالعجبی سے جنم لینے والے فتنوں کی یادگار کہانی

میرے گھر والے مجھے اللہ میاں کی گائے کہتے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان اپنے ضلع سے پاس کر لیا تو میری یہی سادگی اور معصومیت مزید تعلیم کے لیے مسئلہ بن گئی۔ گھر میں ہر وقت یہ بحث رہتی کہ میں شہر جا کر کیسے تعلیم حاصل کروں۔ خاص طور پر اماں میری جدائی گوارا نہیں کر سکتی تھیں مگر ابا مجھے ضلع کا ڈی سی دیکھنا چاہتے تھے۔ شہر میں میرے چاچا رہتے تھے۔ اماں کو ان پر بھروسا نہیں تھا۔ کہتی تھیں ''لاکھ کے سہی مگر اللہ دین کی طرح خیال نہیں رکھیں گے۔'' انہیں دراصل یہ ڈر تھا کہ میں شہری کا ہو کر نہ جاؤں۔ میری سادگی اور اعتقادی شرافت کو شہر کی مکاریاں نہ کھا جائیں۔

ہر ماں کی چاہت ہے کہ اس کا بیٹا شادی کے بعد بھی پلو سے بندھا رہے۔ اس کے بیٹے پر بہو کا بھی بھرپور سایہ نہ پڑے لیکن بہو تو ابھی کوسوں دور تھی۔ مسئلہ تعلیم کا تھا۔ ابا مجھے زیادہ سے زیادہ تعلیم دلا کر اعلیٰ سرکاری افسر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کے انہی بلند حوصلوں نے مجھے شہر کی رنگینیوں میں پہنچا دیا۔

چاچا امام بخش ریلوے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ہمارے خاندان میں صرف انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ دوسرا میں تھا جو کالج میں داخل ہونے شہر آیا تھا۔ چاچی نے ہمیں دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا ''بھائی جان! ہمارے گھر میں ایک بیٹے کی کمی تھی، وہ آپ نے پوری کر دی۔ میں اسے اتنا پیار دوں گی کہ یہ اماں ابا یعنی کہ آپ کو بھول جائے گا۔''

ابا نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ بات اس کی ماں کے سامنے نہ کہنا۔ ورنہ وہ ابھی آ کر بیٹے کو بلا لے گی۔''

سب ہنسنے لگے۔ ان کا اپنا بیٹا نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی شاہدہ تھی جو مجھ سے پانچ برس چھوٹی تھی۔ اسی لیے میری اہمیت پہلے ہی روز سے اس گھر میں وی آئی پی جیسی ہو گئی تھی۔ ابا مجھے چھوڑ کر اسی شام گاؤں واپس چلے گئے۔

میں نے اپنے ضلع میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے اس لیے شہر کے اچھے کالج میں داخلے کے لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ چند ہی دن میں ہی میری نئی زندگی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں نے خود کو انہی اصولوں کا پابند رکھا جو گاؤں میں تھے۔ کسی اہم وجہ کے بغیر چھٹی کا سوال ہی نہیں تھا اور نہ ہی بعض طلبہ کی طرح آوارگی کی مجھے عادت تھی۔

چاچا اور چاچی دونوں ہی مجھ سے خوش تھے کیونکہ میں شہری ماحول میں پرورش پانے والے لڑکوں سے بہت مختلف تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند۔ میں جب سے ان کے گھر آیا تھا، فجر کی ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ باجماعت نماز کے بعد قرآن کی تلاوت اس کے بعد صبح کی سیر میرے معمولات میں شامل تھے۔ میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ چاچی ہمیشہ میری اچھی خوراک پر توجہ دیتی تھیں۔ وہ میرے صحت مندانہ طور طریقوں پر قربان ہوتی رہتی تھیں۔ آتے جاتے میری بلائیں لیتی تھیں اور چاچا بھی تعریفی

نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اگر اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہ ہو تو میں ان کے دعوے کے مطابق لاکھوں میں ایک تھا۔

وہ مجھے کیوں اتنا چاہتے تھے، مجھ پر کیوں قربان ہوتے رہتے تھے میں نہیں جانتا تھا۔ مجھ میں ان دنوں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ کسی کو نظروں سے یا باتوں سے پہچان پاتا۔ ہمیشہ نگاہیں نیچے کیے اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ شاہدہ کے ساتھ ایک ہی چھت کے سائے میں رہنے کے باوجود وہ میرے لیے نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ بچپن سے جو ذہنی پرورش پائی تھی اس کے مطابق وہ صرف بچی اور بہن نظر آتی تھی۔ وہ بچپن سے شہر میں زندگی گزار رہی تھی لیکن گھر کا ماحول گاؤں جیسا تھا اور زندگی کی شوخیاں اس میں رچی بسی تھیں۔ وہ مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ میری سادگی اس کے لیے ایسی تھی جیسے میں جنگل سے آیا ہوں۔ وہ کھیل ہی کھیل میں میرا تماشا بنا دیتی تھی۔ ایک شام چاچا صحن میں بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چاچی کھلے صحن میں روٹیاں پکا رہی تھیں اور وہ بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ میں نیم کے سائے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی ''منحوس بھیا! دودھ کا ڈول پکڑانا، یہ بالٹی بھر گئی ہے۔''

چاچی نے وہیں سے چلا کر کہا ''منی شاہدہ! اسے تنگ نہ کر۔ تو ہاتھ بڑھا کے پکڑ لے۔ ڈول کون سا دور ہے؟''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں چاچی! کیا فرق پڑتا ہے۔''

میں ڈول لے کر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے ترچھی نظروں سے دیکھا، مسکرائی پھر ڈول پکڑتے ہوئے بولی ''کھڑے کیا ہو۔ جگ کر بالٹی ہٹاؤ۔ پھر میں یہ خالی ڈول رکھوں گی۔''

اس نے دوپٹے کو سر کے چاروں طرف بیچ میں باندھ رکھا تھا جیسے سر میں درد ہو۔ کھلے گریبان کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ میں اس کے کہنے پر ذرا سا جھک گیا۔ جھکتے ہی مجھے کچھ نظر آیا۔ نظر آنا اور بات ہے سمجھ میں آنا اور بات ہے۔ میرا ذہن اتنا معصوم تھا کہ میری آنکھیں فوراً ہی زاویہ بدل کر بھینس کے تھن کو دیکھنے لگیں۔ اسی وقت شاہدہ نے تھن سے نکلنے والی دودھ کی دھار میرے منہ کی طرف کر دی۔ میں بوکھلا سا گیا۔ فوراً ہی پیچھے نہ ہٹ سکا۔ کچھ دودھ آنکھوں میں گیا کچھ میرے کھلے ہوئے منہ میں۔ باقی چہرہ دودھیا گیا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ چاچا بھی اس کی بچکانہ حرکت پر مسکرانے لگے۔ چاچی نے غصے سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ''تو میرے پتر کا مذاق اڑاتی ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی ''ماں جی! ابھی اس کی ماں سے دعائیں ملیں گی، دودھ پینے کو دودھ نماز اور پوتوں پھلو۔ آج میں نے تو گویا دعا پوری کر دی ہے۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ چاچا نے مجھ سے کہا ''پتر! بھائی جان اور بھائی جان نے تجھے ملی کا مادھو بنا کر رکھا ہے۔ ارے گھر

دور سے اُس کی آواز گنگناتی آئی "آ رہی ہوں۔"

مجھے ایسے لگا جیسے وہ میرے پاس آنے کے لیے "آ رہی ہوں" کہتی آ رہی ہے۔ میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ فی الوقت یہ حالت تھی کہ نظر اُس کے باوجود اپنی قسم دکھا رہی تھی۔ جو اس پر چھاپا مار رہی تھی۔ پھر ایک ہی انگڑائی ہوئی تپش سے دیکھنے پر کیا قیامت ڈھائے گی؟ اس لیے میں نے منہ پھیر لیا تھا۔

میرے کمرے کی طرف آتے وقت قدموں کی دھمک سنائی دی پھر اس کی آواز سنائی دیتی آئی۔

چاچی نے پوچھا "تم بازار جا رہی ہو؟"

"کیا آپ بازار جانے پر اعتراض کریں گی۔ یہ صاحب جو منہ پھیر کر لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے اعتراض فرمایا ہوگا۔"

"ارے یہ بات نہیں ہے۔ بازار جا رہی ہے تو اس کا خط لیتی جا۔ پوسٹ آفس سے لفافہ لے کر اس کو پوسٹ کر دینا۔"

اس نے پوچھا "کہاں ہے خط؟"

چاچی نے مجھ سے پوچھا "بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"کوٹ کی جیب میں ہے۔"

میں اُدھر نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاں اُن کی آوازیں سن رہا تھا۔ چاچی یہ کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگیں "جیب سے خط نکال لے اور یہاں کھڑی رہ کر بک بک نہ کر۔ یہ کالج سے تھکا ہوا آیا ہے۔ اسے آرام کرنے دے۔"

اُن کی آواز دور ہوتی گئی۔ وہ جا چکی تھیں۔ میں بستر پر اوندھا ہو گیا۔ دونوں بانہوں میں منہ چھپا کر چوری سے اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گردن سے پیچھے دکھائی دے رہی تھی۔ اگر جو دیکھنے کے لیے اپنا بازو ذرا اٹھاتا تو وہ مجھے دیکھتے ہوئے دیکھ لیتی۔ ہمارے درمیان کبھی پردہ نہیں رہا۔ میں اب بھی آزادی سے دیکھ سکتا تھا لیکن میری نظروں کی معصومیت میں فرق آگیا تھا۔ معصومیت مشکوک ہونے کے باوجود میرے دل میں کوئی بدمعاشی نہیں تھی۔ میری نظریں شکاری نہیں بھکاری تھیں۔ بھیک میں پوری روٹی نہیں ملتی۔ پوری دولت نہیں ملتی۔ میری نگاہوں کو اس کے بدن کی خیرات کہیں کہیں سے مل رہی تھی۔ کبھی اِدھر سے نظر آتی تھی کبھی اُدھر سے جھلک رہی تھی۔ اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا پھر الماری کے پاس جا کر اسے کھولا اور وہاں میرا کوٹ لٹکانے کے بعد الماری بند کر دی...... اس کے بعد کمرے سے جانے لگی۔ میں جس طرح بازوؤں میں منہ چھپائے ہوئے تھا اس زاویے سے اپنے کمرے کا دروازہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ میری محدود نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے اسی رفتار سے چلتی ہوئی دروازے سے گزرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی ہوگی۔ مگر اس سے غافل ہو گیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ اس کی آہٹ نہیں ملی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے جلدی سے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔ اُس کی ہنسی دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجھ سے زیادہ سمجھدار تھی۔ بڑی دیر سے میری چور نگاہی کو سمجھ رہی تھی۔

میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی وہ تمام شرارتیں جو کرتی رہی تھی مجھے یاد آ رہی تھیں۔ میں ابتدا ہی سے اسے محض چاچا کی بیٹی سمجھتا رہا۔ آج اس راکھ ہونے والی عمر نے سمجھایا تھا کہ وہ جوانی میں کزن ہوتی ہے۔ یہی بات شاہدہ کو کسی نے نہیں سمجھائی تھی۔ اس کے باوجود وہ اکثر مجھے کزن کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

"کزن! ذرا وہ ڈول اٹھا کر دو۔"

"کزن! آج نماز کے لیے اٹھو تو مجھے جگا دینا۔"

"کزن! بین الاقوامی میں کتنے الف ہوتے ہیں۔"

اور میں کہتا تھا "بس جاؤ تمہیں پاس کر چکی ہو اور تمہیں بین الاقوامی کے ہجے نہیں آتے۔ شرم کرو۔"

اب مجھے شرم آ رہی تھی۔ میں خواہ مخواہ کزن کے سہولت بھرے رشتے کو شیطان کی آنت کی طرح پیچیدہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ آنچ ہوتی گئی تھی اور اپنی ہنسی میرے اندر چھوڑ گئی تھی۔ وہ ابھی تک مجھے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یاد آیا وہ نہانے کے بعد کیسے پیارے انداز میں بدن کو خم دے کر گیلے بالوں کو جھٹکتی تھی۔ میں جیم کے سامنے میں پڑھتا رہتا تھا۔ بھیگی زلفوں کے چھینٹے مجھ تک آتے تھے۔ یہ سب وہ دور کی حکایتیں تھیں۔ میں نے کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ایک بار اس کے دوپٹے کو پکڑا تھا۔ آج وہ میرے دونوں ہاتھوں میں بجلی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں میری کون سی رگ پھڑک رہی تھی کہ لیٹنے سے آرام آ رہا تھا نہ بیٹھنے سے قرار مل رہا تھا۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ جب تک اپنے اندر کی خوشی کا اظہار عمل کر نہ کیا جائے' یہ بے چینی نہیں جاتی۔ میں شاہدہ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کیوں خوش ہوں؟ ابھی مجھ میں جرأتِ اظہار کی کمی تھی۔

میں کمرے سے باہر آگیا۔ راہداری سے گزرتا ہوا چاچی کے کمرے میں آیا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چاچا کرسی پر حقہ گرم کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا "آؤ بیٹے تمہاری چاچی کہہ رہی تھیں تم سو رہے ہو۔"

میں پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر لیٹتے ہوئے اپنا سر چاچی کے زانو پر رکھ دیا۔ میرا بچپن اسی گود میں گزرا تھا۔ میں انہی زانوؤں پر لوریاں سنتے سنتے سو جایا کرتا تھا۔ آج ایک مدت کے بعد پھر ان کے زانو پر سر رکھا تو وہ ممتا سے بھر گئیں۔ بڑے پیار سے میرے سر کو سہلاتے ہوئے بولیں "کیا بات ہے؟ آج میرے بیٹے کو بڑا پیار آ رہا ہے۔"

"چاچی امی! یوں کہوں تو آپ یقین نہیں کریں گی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آج ہی میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ آج ہی پیار کیا ہے۔ آج سے پہلے آپ کہاں تھیں؟"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر چاچا نے پوچھا "کچھ تو معلوم ہو کہ اپنی چاچی پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "پیار تو ہمیشہ اپنے رشتوں پر قائم رہتا ہے۔ ہم ہی مصروفیات کے باعث اِدھر اُدھر گم رہتے ہیں۔ ہمارے خون کا' ہمارے دودھ کا اور ہماری کسی نئی محبت کا رشتہ سامنے ہوتا ہے اور ہمیں اپنی الجھنوں میں اس کے وجود کا پتا نہیں چلتا۔ جب اچانک پتا چلتا ہے تو اس پر اتنا پیار آتا ہے' اتنا پیار آتا ہے کہ..."

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہیں دونوں بازوؤں میں لے کر بولا۔ "آپ مجھے بچپن میں کیسے پیار کرتی تھیں؟"

میں نے پیار مانگنے کے لیے اپنا ایک گال اُن کی طرف کیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے ایک بوسہ لیا۔ میں نے بھی پلٹ کر انہیں پیار کیا تو وہ ہنستے ہنستے بولیں "یہ لڑکا آج دیوانہ ہو گیا ہے۔"

میں اچھل کر پلنگ سے فرش پر آیا پھر بولا "آپ کو بیسن کے لڈو بہت پسند ہیں۔ میں ابھی موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے جاؤں گا اور ابھی لے کر آجاؤں گا۔ پھر اپنے ہاتھ سے آپ کو لڈو کھلاؤں گا۔"

میں پارے کی طرح اَن ایزی ہو گیا۔ چاچی کو سیلوٹ کیا تو وہ دونوں ہنسنے لگے۔ میں اباؤٹ ٹرن ہو کر "لیفٹ رائٹ' لیفٹ رائٹ" کہتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ وہ اتنے خوش تھے کہ باہر تک اُن کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ انہیں جیسے دو جہان کی خوشیاں مل رہی تھیں۔ میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ محبت کا جو اظہار کرنا چاہیے تھا' وہ میں نے عمل کر کیا تھا۔ جتنی بے باکی سے کیا تھا۔ انہیں دو جہاں ملے تھے' مجھے پوری کائنات مل گئی تھی۔ میں نے آج اور کائنات کو چوم لیا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر بازار کی طرف چل پڑا۔

میں جو بھی حرکتیں کر رہا تھا وہ غیر شعوری طور پر کر رہا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے چاچی سے اتنا پیار کیوں کیا؟ یہ بعد میں علمِ نفسیات نے سمجھایا اور یہ بھی سمجھایا کہ بازار میں صرف بیسن کا لڈو نہیں ملے گا' شاہدہ بھی دیکھنے کو ملے گی۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ میں مٹھائی خریدنے کے بعد بھی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ کئی بار پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرا تو دل نے کہا۔ میری نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی ہیں۔

اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے شام ہو گئی۔ وہ دلربا گھر میں ملی۔ میں واپس آیا تو وہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل اس کے قریب لا کر روک دی۔ اس نے مجھے دیکھا پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی "سوچا تو میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی پھر کہا "مجھے کیا ضرورت ہے پیچھا کرنے کی؟ میں ایسی چیز خرید کر لایا ہوں جو تمہاری چاچی کو بہت پسند ہے مگر تمہیں نہیں دوں گا۔"

وہ کوٹھی کے اندر گئی۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا چاچا' چاچی کے کمرے میں گیا۔ چاچی نے کہا "میں سوچ رہی تھی کہ وہ دونوں ساتھ واپس آئیں گے۔"

وہ بولی "آپ غلط سوچ رہی تھیں۔ مجھے تو موٹر سائیکل سے وحشت ہوتی ہے۔ ویسے میں نے خط پوسٹ کر دیا ہے اور یہ آپ کے لیے بیسن کے لڈو۔"

وہ اپنے تھیلے سے مٹھائی کا ڈبا نکال رہی تھی۔ میں نے بھی شاپنگ بیگ سے مٹھائی کا ڈبا نکالتے ہوئے کہا "یہ تو میں لایا ہوں اپنی چاچی کے لیے۔"

چاچا نے کہا "تعجب ہے تم دونوں الگ الگ جا کر ایک ہی چیز لائے ہو اور وہ بھی اپنی اپنی چاچی کے لیے۔ میں بے چارہ تو کسی گنتی میں نہیں ہوں۔"

"چاچا! آپ کھانے میں بھی ہیں اور پینے میں بھی ہیں۔ یہ کمال بچی لڑکی بچپن کی طرح سوالی ہوتی ہے اسے کچھ کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ وہاں امی اور ابا کے پاس بھیجیے۔ کچھ مل جانے کی مشکل کا انداز ٹھیک ٹھاک ہے گی۔"

چاچا اور چاچی نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر چاچی بولیں "بیٹے! تم جب کہو گے تمہاری امی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

شاہدہ شرماتے ہوئے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کمرے سے جانے لگی۔ تب مجھے عقل آئی کہ میں نے بچپنے کے لیے سوالی میں کیا کہہ دیا ہے اور اس کا مطلب کیا نکل آیا ہے۔ جو مطلب نکالا وہ حسبِ حال تھا۔ مجھے تو یہ دیکھ کر حال نہیں ملا کہ وہ کس ادا سے مسکرا گئی تھی۔

رات کا کھانا ہم ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ اس رات کھانے کے بعد بارش ہونے لگی۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

چاچی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بیٹی سے کہہ رہی تھیں۔ "کئی شلوار آنگن میں کپڑے پڑے ہیں۔ جلدی اٹھا لے۔ مجھے یہ تولیہ ڈال دے نہیں تو سر بھی بھیگ جائے گی۔"

میں اس کھڑکی کے پاس آیا جو آنگن میں کھلتی تھی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ پورے آنگن میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے آکر روشنی اور بارش میں نہانے لگی۔ بارش خاصی تیز تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تر ہو گئی۔ گیلے کپڑے اتار کر رسی پر ڈالتی جاتی تھی پھر واپس آکر دوسرے کپڑے سمیٹنے لگی۔ اتنی دیر میں اس کا لباس بھیگ بھیگ کر اتنا بے پرت ہو گیا تھا۔ بدن سے ایسے چپک گیا تھا جیسے شیشے کے آر پار نظاروں سے چپک جاتی ہیں۔ میں تو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

اس نے ایک اجلی کا کپڑا سمیٹتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا۔ کیا وہ دور سے مجھے دیکھ رہی تھی کہ میں جاگ رہا ہوں؟ جلدی سے اس نے ایک ادائے ناز سے گردن گھمائی پھر تیزی سے کوٹھی کے اندر آنے کے لیے بڑھی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ابھی آنگن میں بہت کچھ پڑا تھا۔ وہ پھر آنے والی تھی۔ میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس نے مجھے تصویرِ حیرت بنا کر کھڑکی کے قریب سے ہٹا کر رکھ دیا تھا۔

وزاورِ صحت سگریٹ کو مضرِ صحت کہتی ہے۔ ایک ہی اسکرین پر دو رخی باتیں اسی لیے ہوتی ہیں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ کاروبار میں حرام منافع سے اور جذبات میں گناہ کی لذت سے باز نہیں آتا۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ قاسم نے کہا "یار! ہم لوگ تو سن موئی ہیں۔ اپنی کھال میں مست رہتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اگر ہم سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو کہیں...."

میں نے بات کاٹ کر کہا "نہیں، بالکل نہیں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"یار! یہ کیا بات ہے۔ ہماری حرکتوں سے دوسروں کو یوں لگتا ہے جیسے ہم بُرا کر رہے ہیں۔ جبکہ ہم ان کے حق میں بھلا کرتے ہیں۔ بھئی محمود، ذرا شاہنواز کا قصہ سناؤ تو...."

محمود نے کہا "سننے والوں کے لیے قصہ ہو سکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے۔ میرے محلے میں ایک نوجوان شاہنواز رہتا تھا۔ بڑا تنہا تمہاری طرح کم گو تھا۔ کسی سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ محلے میں بھی شاید ہی کسی سے بات کرتا ہو۔ میں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ اس نے نظرانداز کر دیا۔ بس یہی انسلٹ برداشت نہیں ہوئی۔ میں کوئی گرا پڑا بندہ ہوں کہ وہ مجھے دوستی کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔"

قاسم نے ہاتھ اٹھا کر کہا "ہمارا سلیقہ بھی سیدھی سی بات ہے۔ جو ہم سے کھنچ کر جاتا ہے ہم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جب محمود نے بتایا کہ وہ شاہنواز بڑا اکڑتا ہے۔ کسی کے آگے گھاس نہیں ڈالتا ہے تو میں نے کہا ہم اس گدھے کے آگے گھاس ڈالیں گے۔ پھر جانتے ہو، ہم نے کیا کیا؟"

میں نے تجسس سے پوچھا "کیا کیا؟"

اس نے کہا "بھئی محمود تم ہی بتاؤ۔ میں کیا اپنے منہ سے بولوں؟"

محمود نے کہا "ہمیں پتا چلا کہ شاہنواز سانپوں سے بہت ڈرتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی قاسم نے ایک سپیرے کو پکڑا۔ وہ نشے کا عادی تھا۔ پانچ سو روپے کے عوض ایک سانپ لے آیا۔ ہماری ہدایت کے مطابق اسے ایک مٹھائی کے ڈبے میں رکھ کر اوپر سے رنگین کاغذ اور ربن کے ساتھ پیک کر دیا۔ ہم نے ایک تھیلے میں اپنے ہی چار مٹھائی کے ڈبے رکھے پھر شاہنواز کے دروازے پر آ کر دستک دی۔"

اس نے چاندی کی تھال سے کچھ بادام اٹھا کر منہ میں رکھے پھر انہیں چباتے ہوئے کہا "شاہنواز آیا تھا۔ ہم نے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ باقی گھر والے شاپنگ پر گئے ہیں۔ اس نے دستک سن کر دروازہ کھولا۔ میں نے کہا ہمارے دوست اسلم کی بہن کی بات پکی ہوئی ہے۔ اس خوشی میں یہ مٹھائی ہے۔ اس نے وہ ڈبا لے کر شکریہ ادا کیا۔ ہم دوسرے گھروں میں مٹھائی بانٹنے کے بہانے جلدی کھسک گئے۔ وہاں سے ذرا دور جا کر رک گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی شاہنواز کی چیخیں سنائی دیں۔ بچاؤ، بچاؤ... سانپ... سانپ..."

میں نے جلدی سے پوچھا "کیا سانپ نے اسے ڈس لیا؟"

قاسم نے میری پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا "یار! بھولے بادشاہ! کیا جان بوجھ کر ہم نے زہریلا سانپ دیا تھا؟ دراصل وہ سپیرا چرسی تھا۔ نشے کی طلب مار رہی تھی۔ وہ پانچ سو روپے کے لالچ میں اپنے جوگی مہاراج کا ایک پٹارا اٹھا لایا تھا۔ اس پٹارے میں زہریلا سانپ تھا۔"

محمود نے کہا "پڑوسیوں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ وہ بچ گیا۔ ہم تو کئی ماہ تک اس کے سامنے نہیں گئے۔ ایک دن اس نے میرا راستہ روک کر کہا۔ محمود بھائی! میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ نہیں جانتے میں کینسر کا مریض تھا۔ خدا آپ کو اور نیکی دے۔ اس سانپ کے زہر سے کینسر کا مرض ختم ہو گیا ہے۔ آپ کبھی گھر آئیں میں میڈیکل رپورٹ دکھاؤں گا۔"

اسلم نے مجھ سے کہا "تم نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ ایک جوگی بابا سانپوں سے ڈسوا کر کینسر کا علاج کرتے ہیں۔"

میں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ واقعی میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا لیکن یقین نہیں آیا تھا۔ محمود اور قاسم وغیرہ دہرا رہے تھے۔ ایسا ہو چکا تھا۔ جوگی بابا نے اگلے روز ایک مریض کا علاج کرنے کے لیے کچھ پڑھ کر اس سانپ پر دم کیا تھا۔ چرسی سپیرا وہی سانپ چرا کر لے آیا تھا۔ یوں شاہنواز کو کینسر کے مرض سے نجات مل گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے شاہنواز کے قتل کے ارادے سے ایسا کیا تھا۔ وہ تو سانپ کو بے ضرر سمجھ کر اس کو ڈرانا چاہتے تھے۔ قاسم نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا "ہماری حرکتوں سے دوسروں کو یوں لگتا ہے جیسے ہم بُرا کر رہے ہیں جبکہ ہم ان کے حق میں بھلا کرتے ہیں۔ تم اپنی ہی بات لے لو۔ ہم شاہدہ کا نام لے کر تمہیں چھیڑ رہے تھے۔ جبکہ کالج میں شاہدہ نام کی کوئی طالبہ نہیں ہے۔"

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا "اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تمہاری کزن کا نام شاہدہ ہے۔"

میں حیرانی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ واقعی دیکھا جائے تو انہوں نے شاہنواز کے ساتھ بُرا کیا مگر اسے نئی زندگی دی تھی۔ کسی شاہدہ کا نام لے کر کالج میں میرا مذاق اڑایا تھا لیکن ان کا یہ مذاق میرے اور شاہدہ کے لیے بھلا ہو رہا تھا۔ قاسم نے کہا "مرد جب دن کی طرح ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک عورت ہونا چاہیے۔ دن کی اہمیت اس وقت تک اجاگر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ رات نہ ہو۔ اسی طرح مرد کسی عورت کے وجود کے بغیر مرد نہیں کہلاتا۔ ہم نے سوچا تھا کسی فرضی شاہدہ کے پیار کی آگ تمہارے دل میں بھڑکا دیں گے۔ تمہیں زندگی کے ایک نئے خوبصورت پہلو سے روشناس کرائیں گے لیکن تم ہمیں عاشق مزاج اور آوارہ اسٹوڈنٹس لگتے ہو۔"

میں مشکل میں تھا کہ انہیں کیا سمجھوں؟ فرشتے نہیں مان سکتا تھا اور آوارہ بدمعاش بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ انہوں نے شاہنواز کے ساتھ جان بوجھ کر نیکی نہیں کی تھی۔ اتفاقی طور پر کینسر کی علامتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو شاہنواز سانپ کی صرف دہشت سے مر سکتا تھا۔

میرے معاملے میں بھی انہوں نے جان بوجھ کر مجھے ایک محبت بھری زندگی دینے کے لیے میری کزن کا نام استعمال نہیں کیا تھا۔ اتفاقاً ایسا ہوا تھا کہ ایک فرضی شاہدہ کے حوالے سے میری کزن میری محبت کا مرکز بن گئی تھی۔ قاسم نے کہا "بھئی ہم اپنے مہمان دوست کو بور کر رہے ہیں۔ اسلم! باہر زبردست بارش ہو رہی ہے۔ موسم کی مناسبت سے گیت والا دکھاؤ۔ مزہ آئے گا۔"

اسلم ٹی وی اور وی سی آر کے پاس چلا گیا۔ محمود بیئر کی بوتل کھولتے ہوئے مجھ سے بولا "بڑی ظالم شے ہے۔ ایک گلاس پی کر دیکھو۔ موسم رنگین ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو معاف کرو۔ اسے منہ لگانا تو کیا ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میوے اور پھل تو کھاؤ۔ کب سے تمہارے سامنے پڑے ہیں۔"

میں ان کی بات رکھنے کے لیے تھوڑا تھوڑا کھانے لگا۔ وہ چاروں اپنے اپنے لیے گلاس بھر رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین روشن ہو چکا تھا۔ انڈین فلموں کے وہ گانے جو بارش میں فلمائے گئے تھے، انہیں ساون کے گیت کے عنوان سے پیش کیا جا رہا تھا۔ پہلا گیت شروع ہوا تو ایک حسینہ بھری برسات میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں تھی مگر اچانک ہی دل لگ گیا۔ اسکرین پر شاہدہ بھیگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں پچھلی رات کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہی بارش تھی۔ وہی بدن تھا اور وہی بھیگا لباس تھا جو اس کا انگ انگ تراش رہا تھا۔ مجھے کوئی فلمی ہیروئن اچھی نہیں لگتی تھی۔ اگر وہاں شاہدہ نہ دکھائی دیتی تو میں بھی نہ دیکھتا اور اس لیے بھی کھل کر دیکھ رہا تھا کہ وہ آنکھیں نہیں دکھا رہی تھی۔ اپنی امی سے شکایت کرنے کی دھمکی نہیں دے رہی تھی۔

بارش تھم گئی تھی، پھر بھی میں بھیگتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا گیت اچھا لگا۔ دوسرے کے بعد تیسرے نے اور جذبۂ شوق کو بھڑکایا۔ اسے میری دیوانگی کہہ سکتے ہیں کہ اسکرین پر مجھے بدلتی ہوئی ہیروئنوں کے چہرے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ دکھائی تو وہ دے رہی تھی جسے میرا دل چاہتا تھا۔ جہاں تک چاہنے کا تعلق ہے ہم کسی بھی حسینہ کی چاہت کر سکتے ہیں مگر میرا دل صرف اسے مانگ رہا تھا۔ قاسم نے میرا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "کہاں کھو گئے؟ کیسے رہے ساون کے گیت؟"

میں نے قاسم کو دیکھا تو وہ دھندلا سا نظر آیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پوری طرح نظر نہیں آیا کیونکہ میری آنکھوں میں بارش کے کتنے ہی مناظر گھوم رہے تھے۔ وہ ایسی شعلہ بدن تھی کہ بارش میں بجھ رہی تھی نہ نگاہوں سے مٹ رہی تھی۔ میں نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا "کیا اسے پھر دکھاؤ گے؟"

"تو میرے یار! ایک نہیں ہزار بار دیکھو اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی زبردست آئٹم ہے۔ اسلم! وہ گیت والا دکھاؤ جس میں سری دیوی نروان کی تپسیا بھنگ کر رہی ہے۔"

میں نے پوچھا "تپسیا بھنگ کرنا کیا ہوتا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے عبادت کی لگن اور توجہ کو ختم کر دینا۔ اس گیت میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بہت ہی عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ اسے ایک حسینہ اپنے حسن و شباب کے جلوے اور ادائیں دکھا دکھا کر دیوانہ کر دیتی ہے۔"

میں نے وہ گیت والا بھی دیکھا۔ کیا بتاؤں کہ ان گیتوں اور مناظر میں کیسے طوفانی جذبے دکھائے گئے تھے۔ میں تو جوان تھا اگر کوئی بچہ ہوتا تو بیٹھے بیٹھے بالغ ہو جاتا۔ ہمارے ملک کی آبادی اس لیے بھی بڑھ رہی ہے کہ موجودہ نسل کے جوان کم سنی میں ایسے مناظر دیکھ کر بچوں کے باپ بن رہے ہیں۔

میں صبح گھر سے نکلا تھا۔ اس روز اتنی فلمیں دیکھیں کہ واپسی میں شام ہو گئی۔ وہ موٹر سائیکل کی آواز سن کر چھت پر آئی پھر مجھے دیکھتے ہی پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بھاگ کر چھت پر آنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ہر موٹر سائیکل کی آواز پر اسی طرح دیوانہ وار آ رہی ہے اور مایوس ہو کر جا رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے "ہونہہ" کے انداز میں منہ پھیر لیا تھا اور چلی گئی تھی۔

بے قراری بھی تھی۔ ناراضگی بھی تھی۔ نہ آنا تو انکار تھا۔ آ کر جانا انکار تھا۔ اس کی ہاں میں نہ تھی اور نہ میں ہاں تھی۔ یوں کہنا چاہیے اس نے پیار کو پہیلی بنا دیا تھا۔ جہاں تک اسے بوجھو وہاں سے پھر ایک نئی پہیلی بن جاتی تھی۔ عورت کو سمجھنا چاہو تو وہ اپنی ذات میں پہیلی بن جاتی ہے اور [illegible] کرتی چلی جاتی ہے۔

چاچی اور چاچا نے پریشان ہو کر پوچھا "کہاں رہ گئے تھے؟ صبح ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا اور اب اندھیرا ہونے کو ہے۔"

"وہ چاچی! بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس لیے اندھیرا لگ رہا ہے۔ میں لائبریری میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔"

میں چاچا کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ شاہدہ کسی نہ کسی کام سے آ رہی تھی، جا رہی تھی یا پھر آتے جاتے رہنے کے لیے گھر کا کام پھیلا رہی تھی۔ مجھ سے ایسی بے نیاز تھی کہ ایک بار بھی چور نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ چاچی نے ٹوکا بھی کہ چادر باہر لے جا کر کیوں جھاڑ رہی ہے۔ اس موسم میں کہیں گرد اڑتی ہے؟ وہ خواہ مخواہ گرد جھاڑنے کے بعد چادر دوبارہ لا کر بستر پر بچھا رہی تھی۔ یہ بھی ایک انداز تھا کہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی مگر اپنے وجود کی رونق دکھائی جا رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد میں ذرا ٹہلنے کے لیے جاتا تھا لیکن بارش ہونے لگی تھی۔ اس لیے معمول کے مطابق کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بیڈ کے پاس پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کا دروازہ بھی کھلا رہتا تھا۔ میں نے نظریں کھلی ہوئی کتاب پر رکھیں مگر دھیان اس کے کمرے کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آواز سنی۔ سر گھما کر دیکھا تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر پھینک دیا ہے۔ مجھے بہت برا لگا مگر یہی فکر ہوئی کہ صبح سے پہلے نظر نہیں آئے گی۔

سراسر وہ ساقی تھی۔ ہر رات کم از کم گیارہ بجے تک دروازہ کھلا رکھتی تھی۔ مجھے اپنے کمرے سے نظر آتی رہتی تھی۔ آج شام کو بھی خوب نظر آئی لیکن رات کی تنہائی اور ویرانی میں دیکھنے کا موقع آیا تو اس نے دروازے کو بند کر لیا۔ یہ تو واضح طور پر ترسانے اور تڑپانے والی شرارت تھی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میرے اندر ساون کے گیت بھرے ہوئے تھے۔ برسات میں تو بجھے ہوئے کو بھی جلاتے ہیں لیکن یہ برسات میرے اندر شعلے بھڑکا رہی تھی اور بند دروازہ بجلی بن کر چمک رہا تھا۔

میں نے گیارہ بجے تک بے چینی سے انتظار کیا۔ لیکن وہ مقدر کا دروازہ بند رہا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کیسا اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ دماغ میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ اگر وہ دروازہ نہ کھلتا تو میرا دماغ پھٹ جاتا۔ شکر ہے کہ وہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے اس نے مجھے دیکھا۔ نظریں چرا کر راہداری میں آئی۔ وہاں سے گھوم کر امی جان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ وہ ماں کے کمرے کی طرف نہیں گئی تھی۔ کچن کے سامنے رک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر نظریں ملتے ہی وہ کچن میں چلی گئی۔ میری نظروں سے گم ہو گئی۔ کمبخت آنکھ مچولی کھیل کر میرا اشتیاق ہوا کر رہی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کا یہ رومانی انداز صحت مندانہ تھا۔ محبوب کی ایسی اداؤں سے چاہت اور تڑپ بڑھتی ہے۔ صبر کی عادت پڑتی ہے اور ایک دوسرے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن میں نے قاسم کی کوٹھی میں ڈھلتے ہوئے ٹی وی اور وی سی آر کے سامنے رومانس کی شاعرانہ لطافت نہیں دیکھی تھی بلکہ غلاظت دیکھی تھی۔ میرے اندر ایسے مناظر بھرے ہوئے تھے جن میں عورت کے حسن اور شرافت کی بوٹی بوٹی کی گئی تھی۔

ان لمحات میں میرے اندر شاعرانہ لطافت اور رومانس کی چاشنی نہیں تھی۔ صرف اور صرف برسات میں سلگتا ہوا بدن تھا۔ میں نے راہداری میں کھڑے ہو کر سوچا کیا کروں؟ کیا اس کے پیچھے کچن میں جاؤں؟

وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ چاچی کا کمرا کچن کے قریب تھا۔ ہمارے کچھ کہنے سننے کی آواز بزرگوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اسی وقت برتن گرانے کی آواز سنائی دی۔ کمرے سے چاچی نے پوچھا "کی

شاہدہ تو ہے؟"

"جی۔ میں ہوں۔ کچن کا دروازہ بند کر کے جا رہی ہوں۔"

میں نے سنا کہ وہ کچن سے نکلنے والی ہے تو میں لپک کر اس کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ چونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے میں راہداری کو اور اپنے کمرے کے کچھ حصے کو پردے کے پیچھے سے دیکھ سکتا تھا۔ شاہدہ کچن سے نکل کر راہداری میں چلتی ہوئی میرے دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ وہ دروازہ اس کی توقع کے خلاف بند تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ میں اسے دیکھنے کے لیے وہاں کھڑا رہوں گا لیکن اس کی خوش فہمی ختم ہو گئی تھی۔

اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھی کہ میں صحن میں بھیگنے جاؤں گا۔ اس نے دبے قدموں میرے بند دروازے کے پاس آ کر کان لگا کر سنا۔ اسے میرے چلنے کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ وہ دروازے پر ہاتھ لے گئی۔ جیسے کھول کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پھر رک گئی۔ میں پردے کے پیچھے سے واضح طور پر اسے شرماتے دیکھ رہا تھا۔ حیا اجازت نہیں دے رہی تھی کہ دروازہ کھولے یا دستک دے۔

آخر وہ سر جھکا کر سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ وہاں سے پھر میرے بند دروازے کو دیکھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں ہی ایک ہاتھ سے تالی بجانے والی حماقت کر رہا ہوں مگر وہ بھی اپنے کمرے میں میری ہی طرح بے چین رہتی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر بستر پر پھینک دیا۔ اسی وقت میں نے پردے کے پیچھے سے نکل کر دروازے کو اندر سے بند کیا تو آواز سنتے ہی وہ چونک کر پلٹ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو دبا لیا۔ اس دباؤ میں حیرت کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

وہ اگلے ہی لمحے میں سنبھل گئی۔ تعجب سے بولی "نگین! یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اس حرکت میں محبت ہی محبت ہے۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر کہا "وہیں رک جاؤ۔ میری آواز اونچی ہوگی تو بات بڑوں تک پہنچ جائے گی۔"

میں رک گیا پھر بولا "بات بڑوں تک نہ پہنچے اسی لیے میں نے دروازہ بند کیا ہے۔"

"تم دروازہ بند کر کے میری اور میرے والدین کی توہین کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ امی اور ابا نے تم پر اعتماد کیا ہے۔ وہ تمہاری نیکی اور شرافت کی قسمیں کھاتے ہیں۔ فوراً دروازہ کھولو۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں شیطان ہوں اور تم پارسا ہو۔ کل سے مجھے بھڑکا رہی ہو۔ بارش میں بھیگ بھیگ کر آگ لگا رہی ہو۔"

"تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ میں کام کرتے وقت تھوڑا بھیگ رہی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ تم مجھے تماشا سمجھ

کر دیکھ رہے تھے۔ اگر میرے ذہن میں گندگی ہوتی تو تمہیں کل رات دوار تک نہ دیتی۔"

"دیکھو شاہدہ! جھوٹ نہ بولو۔ تم میرے لیے بے چین رہتی ہو۔ مجھے پانے کے لیے تڑپتی ہو۔ ابھی میں نے اپنے بند دروازے کے پاس تمہاری بے چینی دیکھی ہے۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی "نگین! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں محبت سے انکار نہیں کرتی ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تمہیں نہیں دیکھتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں۔"

"میں یہی بے چینی دور کرنے آیا ہوں۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "خدا کے لیے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں تمہاری امانت ہوں۔ اپنے بزرگوں سے کہو، مجھے مانگ لیں۔ مانگنے سے میرے میکے کی عزت بڑھے گی۔ ورنہ میں دو کوڑی کی ہو جاؤں گی۔"

میں نے ہاتھ کھینچ کر گرفتار کیا۔ یوں لگا میرے سینے سے آ کر آگ لپٹ گئی ہے۔ اس نے پوری قوت لگائی۔ بڑی جان دار تھی۔ میں جھٹکا کھا کر دو قدم پیچھے گیا۔ میرے اندر سے آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ پھر اس کی طرف لپکا۔ قریب پہنچتے ہی اس کا ہاتھ چل گیا۔ میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ میں پہلے ہی جنون میں تھا اس لیے توازن قائم نہ رکھ سکا۔ دور لڑکھڑاتے گرتے پلنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔ پیشانی پائے سے لگی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ میں نے فرش پر گرتے ہوئے اتنا ہی دیکھا کہ وہ دروازہ کھول کر راہداری میں پہنچ گئی تھی۔ پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر اپنی زندگی سے، اپنے وجود سے غافل رہا۔ شاہدہ کے لیے یہ الزام بن گیا تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں نہیں پہنچا سکتی تھی اور اپنے کمرے میں رات بھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ تو میرے قریب آنے سے بھی ڈر رہی تھی۔ آخر وہ غسل خانے سے ایک چھوٹی بالٹی میں پانی بھر کے لے آئی۔ پھر کچھ فاصلے سے میرے منہ پر تمام پانی پھینکا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بالٹی پھینک کر بھاگتی ہوئی پھر راہداری میں چلی گئی۔ وہاں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا "میں کہاں ہوں؟ کس حال میں ہوں؟ یہ شاہدہ راہداری میں کیوں کھڑی ہے؟"

پھر اچانک یاد آیا کہ یہ شاہدہ کا کمرا ہے اور میں جوانی کی برسات میں نہیں، سامنے پڑی ہوئی بالٹی کے پانی سے بھیگا ہوا ہوں۔ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ مجھے طمانچہ یاد آ گیا تھا۔ اس نے، اس لڑکی نے مجھے مارا تھا! میں اس کا جبڑا پکڑ لوں تو منہ سے اس کا دودھ نکل آئے گا۔ یہ کیا تماشا ہے میرے سامنے؟

میں طیش میں آ کر کھڑا ہوا۔ وہ راہداری میں ایک قدم آگے پیچھا کر بھاگنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میں پیشانی سے بہنے والے لہو کی گرمی اپنے چہرے پر پھیلتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ میں اسے پکڑنے کے انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے دروازے پر آیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی ماں کے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے راہداری میں آ کر اسے غراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر اس انداز سے ہاتھ رکھا جیسے خاموش دھمکی دے رہی ہو کہ میں اسے پکڑنے آؤں گا تو وہ دروازہ کھول کر ماں باپ کے پاس چلی جائے گی یا انہیں نیند سے جگا دے گی۔

میں نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر اسے بے بسی سے دیکھا پھر گھوم کر اپنے دروازے پر آیا۔ آ کے دیکھا وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ میں طمانچے کا جواب طمانچے سے نہیں دے سکتا تھا۔ کیا مجبوری تھی کہ اسے گالیاں بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن نفرت ظاہر کیے بغیر آرام نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف تھوک دیا۔ تھوک وہاں تک نہیں پہنچا۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

جذبات کی کتنی اونچی اڑان تھی اور کتنا نیچے آ کر گرا تھا۔ اس وقت یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ مجھے غصہ کس بات پر آ رہا ہے؟ ایک عورت سے طمانچہ کھانے پر؟ لہولہان ہونے پر؟ یا ساون بھرے زرخیز بدن کو حاصل کرنے میں ناکام ہونے پر؟ یا مجبوری شکست پر تلملا رہا تھا؟

میں بڑی دیر تک بستر کے پاس بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ساتھ ہی قسم بھی کھاتا رہا کہ اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی بے عزتی اور ناکامی کو نہیں بھولوں گا۔ آج رات کے ایک ایک لمحے کا حساب اس سے لوں گا۔

میں نے باتھ روم میں آ کر لائٹ آن کی۔ آئینے میں پیشانی کے زخم کو دیکھا۔ چہرے سے خون صاف کیا۔ زخم سے اب تک لہو بہہ رہا تھا۔ میں نے رومال کے ایک حصے کو آفٹر شیو لوشن میں بھگو کر زخم پر لگایا۔ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ تکلیف تو ہوئی لیکن لہو کا رستا بند ہو گیا۔

میں نے غصے میں کئی بار سوچا کہ بے عزتی اٹھانے کے بعد اب اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے لیکن عقل بھی سمجھاتی رہی کہ ماں کی محبتیں دینے والی چاچی اور باپ کی پوری کرنے والا چاچا کیا سوچے گا۔ جب تک اس گھر سے جانے کی معقول وجہ نہ ہو نہیں جانا چاہیے۔ وہیں رہ کر شاہدہ کو منہ توڑ جواب دینے کا موقع تلاش کرنا چاہیے۔

اس رات بستر پر کانٹے چبھ رہے تھے۔ میں غصے سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ رات کے تین بج گئے پھر صبح کے پانچ بجنے لگے۔ فجر کی اذان ہوئی تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے نماز کے لیے جانا تھا۔ اسی وقت خیال آیا "میں پاک نہیں ہوں۔ میرے اندر وہ ناپاکی وہ غلاظت ہے جسے صرف خدا جانتا ہے اور خدا صرف جسم کی طہارت کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ نیت کی پاکیزگی بھی لازمی ہے۔ بہت برسوں بعد میں نے فجر کی نماز چھوڑ دی۔ لباس تبدیل

کیا۔ ایک کتاب، ایک کاپی اور ایک قلم لیا۔ دروازہ کھول کر راہداری میں آیا۔ شاہدہ اور چاچی کے کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا باہر کا دروازہ کھول کر برآمدے میں گیا۔ وہاں میری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے پیچھے کیریئر پر کتاب اور کاپی کو رکھنا چاہا تو وہاں ایک تہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کھولا۔ بڑے سائز کے کاغذ پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ نیچے شاہدہ کا نام پڑھ کر میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ وہ باہر جھانکنے والی نظر نہیں آئی۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ موٹر سائیکل کو برآمدے سے اُتار کر اسے کھینچتا ہوا احاطے کے گیٹ تک گیا تاکہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز پر چاچا اور چاچی بیدار نہ ہو جائیں۔ باقی وہ خط بتا رہا تھا کہ شاہدہ شب بیداری کرتی رہی ہے۔

میں موٹر سائیکل ڈرائیو کرتا ہوا بازار آیا۔ ایک لسی کی دکان پر گاڑی روکی۔ پھر لسی کا آرڈر دے کر وہ خط پڑھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا "گلزار! تم ایسے تو نہ تھے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پانچوں وقت اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتے ہو، عبادت میں پاکیزگی کو سمجھتے ہو۔ پھر محبت میں پاکیزگی کو کیوں نہیں مانتے؟

گلزار! میں صرف تمہاری ہوں۔ مجھے عزت و آبرو سے اپناؤ۔ رسم و رواج کے مطابق اپنی دلہن بناؤ۔ اس سے پہلے مجھ پر حرف نہ لاؤ۔ مجھے میری ہی نظروں سے نہ گراؤ۔

"رات جو کچھ ہوا اس پر میرا دل کڑھ رہا ہے۔ میرا ہاتھ بے اختیار تم پر اٹھ گیا تھا۔ میں اپنا یہ ہاتھ سنبھال کر رکھوں گی۔ شادی کے بعد اسے توڑ دینا۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے، تم بہت بھولے تھے۔ میں دل ہی دل میں تمہاری شرافت پر قربان ہوتی رہتی تھی لیکن کالج کے ماحول نے تمہاری شرافت اور معصومیت کو مجروح کیا ہے۔ مجھے یہ بات اس وقت یقین سے معلوم ہوئی جب میں نے تمہارے کوٹ کی جیب سے وہ خط نکالا جسے تم اپنے ابا کے نام پوسٹ کرنے والے تھے۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا تو حیران رہ گئی۔ وہ خط نہیں تھا۔ تمہارے خیالات تھے۔ اس میں لکھا ہوا تھا۔ چچا کی بیٹی کو کیا کہا جاتا ہے؟ پھر اس کا جواب لکھا ہوا تھا۔ چچا کی بیٹی بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن ہوتی ہے۔"

میں نے چونک کر سوچا "وہ بہن اور کزن والی تحریر تو میں نے جلا دی تھی۔ دکاندار نے لسی کا گلاس بڑھاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ میں گلاس لے کر پینے لگا۔ خط کے سلسلے میں جو گڑبڑ ہوئی وہ سمجھ میں آگئی۔ میں نے غلطی سے اپنے ابا کو لکھا ہوا خط جلا دیا تھا۔ وہ تحریر جوں کی توں کوٹ کی جیب میں رہ گئی تھی جو بعد میں شاہدہ کے ہاتھ لگ گئی۔

میں نے جلدی سے گلاس خالی کیا۔ لسی کی قیمت ادا کی پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شاہدہ کے خط کو آگے پڑھنے لگا۔ آگے لکھا ہوا تھا۔ "گلزار! وہ تحریر پڑھ کر معلوم ہو گیا کہ تمہاری معصومیت ختم ہو چکی ہے۔ تم کزن کے رشتے سے ملنے والی رعایت کے مطابق مجھ سے شادی بھی کر سکتے ہو اور کوئی جذباتی غلطی بھی۔

"اگرچہ وہ تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نہیں تھی۔ میں تمہاری ہینڈ رائٹنگ پہچانتی ہوں لیکن اس تحریر کا تعلق تم سے اور چچا کی بیٹی سے یعنی مجھ سے تھا۔ میں نے سوچا کہ تم میں اتنی جرأت نہیں ہو گی کہ اپنے ابا سے مجھے مانگ لینے کو کہہ سکو۔ اگر میں اس تحریر کے نیچے تمہارا نام لکھ کر اسے تمہارے ابا کے نام پوسٹ کروں تو وہ میرے متعلق اپنے بیٹے کی پسند کو سمجھ لیں گے۔ وہ بھی مجھے بہو بنانا چاہیں گے تو پھر جلدی رشتے کی بات چل پڑے گی۔"

میں نے شاہدہ کے خط کو مٹھی میں بھینچ کر دل میں کہا "ہائے رے۔ یہ شاہدہ نے ابا تک اسے پہنچا دیا ہے اب کیا ہو گا؟ آج کل میں اس کا جواب آ گیا ہو گا۔"

میں جانتا تھا۔ میری پسند ابا کی پسند ہو گی لیکن جس انداز سے یہ بات وہاں تک پہنچنے والی تھی یا پہنچ گئی تھی اس سے شرم اور جھجک سی ہو رہی تھی کہ امی اور ابا کا سامنا کیسے کروں گا؟

یہ درست ہے کہ میں شاہدہ کو دلہن بنا کر لانے کا معاملہ مہینوں اور برسوں تک ٹال رہا۔ اب یہ معاملہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میری امی رکاوٹ بن سکتی تھیں کیونکہ وہ اپنی بہن کی بیٹی کو میری دلہن بنانا چاہتی تھیں لیکن ڈاک کے ذریعے پہنچنے والی یہ تحریر ثابت کرے گی کہ میں بھی امی کے فیصلے کے خلاف چچا کی بیٹی کو پسند کرتا ہوں۔

ایک بات کھٹک رہی تھی۔ شاہدہ اپنی حرکتوں سے مجھ پر حاوی ہو رہی تھی۔ میں جو چاہتا تھا وہ ہونے نہیں دیتی تھی۔ خود جو چاہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔ جس رات بارش میں بھیگ رہی تھی اس رات اس نے آنکھیں دکھائی تھیں جیسے میں اس سے ڈرتا ہوں مگر حالات سے مجبور ہو کر ڈر گیا تھا۔ وہ موقعے سے فائدہ اٹھانا جانتی تھی اور کسی نہ کسی طرح اپنا پلڑا بھاری رکھ کر مجھے اپنے دباؤ میں رکھتی تھی۔ پچھلی رات وہ ہار جاتی لیکن ہارنا نہیں جانتی تھی۔ ایسا وقت آنے سے پہلے اس نے مجھے زخمی کر دیا۔ میری شہ زوری کو کمزوری میں اور کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا۔ یہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد پر حکومت کرتے رہنے کے لیے شادی سے پہلے اس پر دباؤ ڈالتی ہیں۔

اس نے وہ تحریر ڈاک کے ذریعے ابا کے پاس بھیج کر بہت چالاکی دکھائی تھی۔ جس طرح اب تک ہر معاملے میں مجھ پر دباؤ ڈالتی رہی تھی اس تحریر کے ذریعے بھی دباؤ ڈال کر دلہن کے روپ میں حکومت کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی اور اس پر عمل کر چکی تھی لیکن اس طرح اس نے مجھے بھی چالاکی سکھا دی تھی۔ میں اسے اپنے حواس پر اور اعصاب پر سوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اسے شیرنی بن کر آنے نہیں دوں گا۔ شادی سے پہلے ہر طرح اپنے دباؤ میں رکھوں گا۔ پھر اسے شیرنی سے بکری بنا کر شادی کروں گا۔

میں نے ڈاکٹر سے پیشانی کے زخم کی مرہم پٹی کرائی۔ کالج

جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ راستوں میں، بازاروں میں کوئی جوان لڑکی نظر آتی تو وہ شاہدہ لگتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ مجھے کسی دوسری لڑکی میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں کسی کے حسن و شباب کو دیکھ کر ذہنی تفنن کے طور پر اس کی طرف مائل ہونا چاہتا تھا تو دل کہتا تھا کہ یہ کزن کے مقابلے میں خاک بھی نہیں ہے۔

شاہدہ کے معاملے میں بہت سے عوامل کار فرما تھے۔ ایک تو وہ رفتہ رفتہ حواس پر چھا گئی تھی۔ پھر میں نے جتنا قریب سے اس کے جلوے دیکھے تھے اتنا قریب کوئی دوسری نہیں آئی تھی۔ پھر وہ میری ضد بن گئی تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں راسخ ہو گئی تھی کہ شادی سے پہلے اسے نہ توڑ سکا، اس کی برتری ختم نہ کر سکا تو پھر ہرگز شادی نہیں کروں گا۔

شام کو گھر آیا تو چاچی اور چاچا ناراض ہونے لگے۔ صبح میں ناشتا کیے بغیر چلا گیا تھا۔ وہ میرے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ میری پیشانی پر کراس پٹی دیکھ کر اور پریشان ہو گئے۔ میں نے تسلی دی۔ جھوٹ کہہ دیا کہ موٹر سائیکل سے گر پڑا تھا لیکن معمولی چوٹ آئی ہے۔ شاہدہ دور ہی دور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے میرے چہرے پر اپنے خط کا جواب پڑھنا چاہتی ہو۔ میں نے اسے لگاوٹ سے نہیں دیکھا۔ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ الڑ کی کبھی نظروں سے گرتی ہی نہیں تھی۔ ایسی پیاری لگتی تھی کہ دل میں گھسی آتی تھی۔

عورت کی یہی کشش مرد کو اس کا مرید بنا لیتی ہے۔ جو جلوہ حسن و شباب کی تابانی اور اداؤں کی دلربائی سے نکل آتا ہے، وہی مرد میدان ہوتا ہے۔ وہ اگلی صبح میرے کمرے میں ناشتا لے کر آئی۔ ٹرے میز پر رکھنے لگی۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا "تمہارے خط کا جواب سنانا چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر بولی "میں سن رہی ہوں۔"

"ابھی نہیں۔ رات کو جواب دوں گا۔"

اس نے ایکدم سے گھبرا کر دیکھا۔ پھر جلدی سے منہ پھیر کر بولی۔ "میں۔۔۔ میں رات کو نہیں آؤں گی۔"

"نہیں آؤ گی تو مختصر سا جواب سن لو۔ ابا تمہیں بہو بنانے آئیں گے لیکن میں شادی سے انکار کر دوں گا۔"

اس نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "کل رات کی غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ چاہو تو ابھی میرا ہاتھ توڑ دو۔"

"میں تم سے شادی کروں گا تمہارا ہاتھ نہیں توڑوں گا۔ تمہاری غلطی معاف کر دوں گا۔ شرط یہی ہے کہ جب بلاؤں تب چلی آؤ۔ اس کے آگے کچھ نہ بولو۔ بولو گی تو کچھ نہیں سنوں گا۔"

وہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں ایک فاتح کی شان سے ناشتا کرنے اور چائے پینے بیٹھ گیا۔ میں پہلی بار اسے کمزور بنا کر ایک دوراہے پر لے آیا تھا اور یہی دانائی ہے، کسی کو بھی تابعدار بنانے کے لیے اسے پہلے سے کمزور بنائے رکھنا ضروری ہے۔

تمام دن اضطراب میں گزرا۔ رات کو کھانا بھی اچھی طرح کھایا نہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ وقت جلدی گزرے۔ رات گہری ہو، بزرگ سو جائیں، سناٹا چھا جائے تو وہ چھم سے چلی آئے۔ میں نے کھانے کے دوران اسے دیکھا تھا۔ وہ چپ چپ سی تھی۔ وہ کشمکش میں ہو گی اسی لیے کسی سے نہیں بول رہی تھی۔ چاچا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چاچی کچن میں گئیں۔ اس نے جلدی سے میز پر ذرا جھک کر سرگوشی میں پوچھا "تمہاری کیا شرط ہے؟ کیا میں رات کو آؤں؟"

میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا "ہاں، آج رات کو۔"

"کیا تمہارے کمرے میں آؤں؟"

"اور نہیں تو کیا میدان میں ملو گی؟"

"میں آؤں گی تو تم شادی سے انکار نہیں کرو گے؟"

"تم میرا کہا مانتی رہو گی تو ضرور شادی کروں گا۔"

"اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر کہو۔ آج آؤں گی اور جب بلاؤ گے تب آؤں گی تو جلد سے جلد شادی کرو گے۔"

میں نے امی اور ابا کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ جلد سے جلد اسے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ وہ اٹھ کر ماں کے پاس کچن میں جانے لگی۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ دل میں اعتراف کیا "وہ جاتی ہے تو سانس جاتی ہے، آتی ہے تو سانس آتی ہے۔ بڑی حیات پرور ہے۔ اسے ضرور شریکِ حیات بناؤں گا اور اس سے پہلے تابعدار بننے کی ٹریننگ دیتا رہوں گا۔

کھانے کے بعد میں کمرے میں آگیا۔ وہ ماں بیٹی کچن کی صفائی کر رہی تھیں۔ برتن دھو رہی تھیں۔ معشوق نے ملنے کا وعدہ کیا ہو تو انتظار سب سے بڑی سزا بن جاتا ہے۔ میں دکھاوے کے لیے دروازہ کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد گھر میں گہری اور پُراسرار خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں جو قلم چلنے والی تھی میں تصور میں اس کا نمونہ دیکھنے لگا۔ اس نمونے میں ساون کے گیتوں والی حسینائیں بھی جھلک رہی تھیں اور ہر حسینہ شاہدہ کا بدن چرا کر اپنے بدن پر سجا رہی تھی۔ اس دیوانگی کو کیا کہیے کہ ہر سو وہی ایک بدن انگڑائیاں سا لیتا تھا۔

بڑی دیر ہو گئی۔ میں نے دروازے پر آ کر دیکھا۔ پورا گھر خاموش تھا۔ راہداری ویران تھی۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ ایسے میں اس دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ نے دل دھڑکا دیا۔ دور پر نظر گئی۔ وہ ذرا سا کھلا تھا۔ وہ ذرا سی جھلک رہی تھی۔ اس کا یوں آنا، ہائے کیا آنا تھا، صبر کو آزمانا تھا۔

دروازہ اور ذرا سا کھل گیا۔ اس کا گورا گورا گلابی گلابی چہرہ نگاہوں کے سامنے کھل گیا۔ اس نے سفید بے داغ لباس پہنا تھا۔ سفید دوپٹہ سر اور چہرے کے اطراف یوں بندھا ہوا تھا جیسے لڑکیاں نماز پڑھتے وقت باندھتی ہیں۔ پھر وہ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔

پوری طرح اس سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سامنا ہوتے ہی میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ یہ مردانہ ارادہ تھا کہ آگے بڑھ کر اسے حاصل کروں لیکن پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں کسی تیسرے کا خوف نہیں تھا۔ مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ مجھے ایک فاتح کی شان سے آگے بڑھنا تھا لیکن پیچھے ہٹنے کے بعد ایک اور قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں الٹے پاؤں کمرے میں آگیا۔ وہ سیدھے پاؤں میرے دروازے پر آگئی۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ ... یہ کیا حرکت ہے؟ جاؤ ... واپس جاؤ۔ اسے اپنے کمرے میں رکھ کر آؤ۔"

اس کے سینے پر ایک چھوٹے سائز کا کلام پاک تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ نہایت ہی دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ "میں نے وعدہ کیا تھا۔ رات کو آؤں گی۔ تمہارے کمرے میں آؤں گی۔ سو آگئی۔"

وہ آگے بڑھی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر کہا "ہاں ... مگر ... مگر ..."

"تم نے آنے کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ صرف آنے کو کہا تھا۔"

"ہاں مگر تم چالاک ہو۔ تم میری نیت کو سمجھ کر آئی ہو۔"

"ہاں سمجھ کر آئی ہوں اس لیے یہ کتاب لائی ہوں۔ تم کل تک اسے روز صبح پڑھتے تھے اور برسوں کی پڑھائی آج رات بھول گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس کا احترام کر رہے ہو اور خدا سے ڈر رہے ہو۔"

میں پیچھے جاتے جاتے الماری سے لگ گیا تھا۔ منہ پھیر کر بولا۔ "اسے لے جاؤ پھر آ کر میری بات سنو۔"

"شادی سے پہلے جب بھی آؤں گی اس کتاب کے ساتھ آؤں گی۔"

میں نے جھلا کر کہا "بکواس مت کرو۔ مجھے الو بناتی ہو اور شادی کا خواب دکھاتی ہو۔"

"کیسا خواب؟ تم نے اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ میں رات کو تمہارے کمرے میں آؤں گی تو تم جلد سے جلد شادی کرو گے۔"

مجھے بھولی ہوئی قسم یاد آئی۔ میں نے اسے شدید حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ لڑکی بہت خطرناک ہے۔ زبردست مکاری سے مجھے ماں باپ کی قسم کھلائی ہے۔ اب ایسے آئی ہے کہ میں اس کی آمد سے نہ انکار کر سکتا ہوں اور نہ اپنی قسم کو بھولی کہہ سکتا ہوں۔ جو لڑکی شادی سے پہلے اس طرح گھیر سکتی ہے وہ شادی کے بعد جانے کیسے کیسے نامعلوم شکنجوں میں کستی رہے گی۔"

میں نے مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر کہا "میرے اندر دھواں بھر گیا ہے۔ دماغ جل رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں پھٹ پڑوں گا۔ پاگل ہو جاؤں گا۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گا۔"

بولتے بولتے میری آواز تیز ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے

بے خبری

پولیس مین: "ہاں تو خاتون! آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نوجوان نے آپ کے موزے میں چھپی ہوئی رقم چرائی ہے؟"

حسینہ: "جی ہاں ... اور میرا دعویٰ درست ہے۔"

پولیس مین: "لیکن جب یہ آپ کے موزے سے آپ کے بیٹھے ہوئے یقیناً رقم نکال رہا تھا تو آپ نے کوئی مزاحمت یا چیخنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

حسینہ: "دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ رقم ... پیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

جانے لگی کہ کہیں آواز سن کر اس کے والدین نہ آجائیں۔ میری حالت تھی کہ میں ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جا چکی تھی مگر برسات میں بھیگتا ہوا بدن میری آنکھوں کے سامنے آ آ کر ٹکریں مار رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیوار پر گھونسا مارتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کرنے سے کیا نہیں تھی۔ تصور میں اور زیادہ بھڑک رہی ہے۔ میرے اندر شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ وہ دیکھو۔ وہ بارش میں مچل رہی ہے۔ برسات میں بدن جل رہا ہے۔ بجلی کی طرح چمک رہا ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح میرے ہاتھوں میں آرہا ہے۔ آرہا ہے ... یہ آرہا ہے۔ مگر نہیں آیا۔ پتنگ واپس چلی گئی۔

میں ایک دم سے پھٹ پڑا۔ بے اختیار حلق پھاڑ کر چیخنے لگا۔ "نہیں، نہیں، ۔۔۔۔ دم دما دم برسات میں ۔۔۔۔ دم دما دم برسات میں ..."

مجھے کچھ کچھ سمجھ میں آرہا تھا کہ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ کبھی میرے بھی الماری سے اور کبھی دیواروں سے ٹکرا رہا ہوں۔ میں نے چاچا اور چاچی کی دھندلی سی جھلک بھی دیکھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں میں کن اندھیروں میں کھو گیا تھا۔ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے والے دماغ کو سکون مل گیا تھا۔ اگر پھٹ پڑتا تو زندگی تمام ہو جاتی۔ پھر نہ حسن ہوتا نہ شباب ہوتا۔ رات ہوتی نہ برسات ہوتی۔ میں پچھلی نیکیوں اور موجودہ گناہوں کے ساتھ مٹی میں دفن ہو جاتا۔

ابھی زندگی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کسی اسپتال کا کمرہ تھا۔ چاچی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ "اسے ہوش آگیا ہے۔ ڈاکٹر کو بلائیں۔"

میں نے چاچا کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ چاچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے بچے نے آنکھ کھولی ہے۔ میں سات دیگوں کی نیاز دلاؤں گی۔"

میں بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ دماغ ہر سوچ سے خالی تھا۔ میں نے خالی خالی نظروں سے چاچی کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "ڈاکٹر کہتا ہے تمہارے دماغ پر بہت بوجھ پڑا ہے۔ بیٹے! اتنا نہ پڑھا کرو۔ آگ لگے ایسی موٹی موٹی کتابوں کو جو پڑھنے والے کو پاگل بنا دیتی ہیں۔"

چاچا ڈاکٹر کے ساتھ آگئے ان کے پیچھے نرس اور وارڈ بوائے بھی تھے۔ ڈاکٹر نے میرے شانے کو تھپک کر کہا۔ "ہیلو مائی بوائے! تم تو بہت جوشیلے والے ہو۔ دیکھو بالکل نارمل ہو۔ ہو نا؟"

میں نے پلکیں جھپک کر کہا "جی ہاں۔ تھینک یو ڈاکٹر۔"

وہ معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھ سے باتیں کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "پلیز! آپ سب تھوڑی دیر کے لیے باہر جائیں۔"

چاچا، چاچی، نرس اور وارڈ بوائے وغیرہ باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا "میں دماغی امراض کا معالج ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔ جس قدر کھل کر گفتگو کرو گے اتنا ہی علاج آسان ہو گا۔"

"میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"تم اچانک ابنارمل کیوں ہو گئے تھے۔ تمہارے بزرگ کہتے ہیں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے ایسا کیوں ہوا؟ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے سر میں انگارے بھر گئے ہیں۔ اگر میں زور سے نہیں چلاؤں گا تو دماغ پھٹ جائے گا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ میں چیخنے لگا تھا اور بے اختیار دیوار اور الماری سے ٹکرا رہا تھا۔ ایک بار میں نے چاچا اور چاچی کی موجودگی کو بھی سمجھا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"یہ تم کیفیت بتا رہے ہو۔ وجہ بتاؤ۔ تم کہتے ہو تمہارے سر میں انگارے بھر گئے تھے۔ کیوں بھر گئے تھے؟ وہ کیا بات ہے جو ابنارمل ہونے کی محرک بنی؟"

"ڈاکٹر! مرض کی وجہ ہر مریض نہیں جانتا۔ مرض کیوں لاحق ہوتا ہے اس کی تشخیص ڈاکٹر کرتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا تم بتانا نہیں چاہتے۔"

"کوئی بات ہوتی تو ضرور بتاتا۔"

کیسے بتاتا؟ کیا میں اس جرم کا اعتراف کرتا کہ میرے اندر کی بارود سے کسی شریف زادی کی دھجیاں نہیں اڑیں۔ مجھ وحشت گرد کے پرخچے اڑ گئے اور میں تو اسے شریف زادی مان نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک رات مجھے لہولہان کیا تھا۔ دوسری رات اسپتال پہنچا دیا تھا۔

ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "تمہارے خاندان میں بھی کوئی ابنارمل رہا ہے؟"

میں نے کہا "جی ہاں، میرے دادا آخری تین برسوں میں دماغی مریض رہے۔ ایک ماہ تک مینٹل اسپتال میں رہے۔ پھر انہیں پاگل خانے منتقل کر دیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر نے چاچا کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے بھی تصدیق کی۔ پھر ڈاکٹر نے کہا "فی الحال تشویش کی بات نہیں ہے لیکن احتیاط لازمی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا دورہ پھر نہ پڑے تو ان کے دادا کی مکمل میڈیکل رپورٹ اور نفسیاتی تجزیے کی تفصیلی رپورٹ بھی لے آئیں۔ انہیں ابھی پرسکون رہنے کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔ اگر نیند آئے تو سونے دیں۔ ورنہ ہنستے بولتے رہیں تاکہ ان کا دل بہلتا رہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ چاچی اور چاچا ہنس بول کر میرا دل بہلائیں۔ میرے دل بہلانے کا سامان یہ بزرگ گھر چھوڑ آئے تھے اور میں اس سامان کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو سکون کی دوائیں دی تھیں ان سے دماغ کی گرمی اور جذبات ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ جہاں جنون ہو وہاں سکون نہیں ملتا اور جب سکون مل جاتا ہے تو جنون سرد پڑ جاتا ہے۔

میں بڑے آرام سے سو گیا۔

○✿○

امی اور ابا اطلاع ملتے ہی چلے آئے۔ امی رعنا میں ہانپتی ہوئی اسپتال کے کمرے میں آئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا۔ مجھے چومتے ہوئے پوچھا۔ "ماں کی جان! تجھے کیا ہو گیا تھا؟ کس دشمن کی نظر لگ گئی تھی؟ تو صبح سے رات تک پڑھتا کیوں ہے؟ ان کتابوں کی گرمی نہیں چڑھے گی تو اور کیا ہو گا۔"

ابا نے امی سے کہا۔ "زینت! کتابوں میں گرمی نہیں ہوتی۔ یہ جذبات کے بے قابو ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کتابیں ڈاکٹر پیدا کرتی ہیں مریض نہیں۔ بیٹے کے سامنے زیادہ نہ بولو۔ ڈاکٹر کی ہدایات یاد رکھو۔"

چاچا نے فون کے ذریعے ابا سے کہہ دیا تھا کہ وہ امی جان کی میڈیکل رپورٹ لے آئیں۔ انہوں نے وہ رپورٹ لا کر ڈاکٹر کو دی تھی پھر مجھ سے تنہائی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے؟ تم تو بہت ٹھنڈے مزاج کے تھے پھر دماغ میں گرمی کیسے چڑھ گئی؟ کالج میں کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟ تمہارا چہرہ کہتا ہے تم پریشانی کا زخم کالج سے لے کر آئے تھے۔ اگر کسی نے تمہاری توہین کی ہے، تمہاری خودداری اور برتری کو ٹھیس پہنچائی ہے تو اس کا نام اور پتا بتاؤ۔ میں اس کی لاش تمہیں دکھا کر سکون پہنچاؤں گا۔ اپنے باپ سے کچھ نہ چھپاؤ۔"

"ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود نہیں کہہ پا رہا ہوں کہ کیا کل ہی کا دورہ کیوں پڑا تھا۔"

"بیٹے! ڈاکٹر مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تم عاشق مزاج اور جذباتی ہو۔ میں نے فخر سے کہا کہ میرا بیٹا انتہائی شریف اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ لیکن ڈاکٹر مجھے گھور رہا تھا۔ کہہ رہا تھا اکثر والدین اپنی اولاد کے معاملے میں ایسے ہی نیک خیالات رکھتے ہیں لیکن جوانی کے دنوں سے کیسے کا چھالا ضرور آتا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ تم شاہدہ کو چاہتے ہو۔"

میں نے چونک کر کہا "نہیں، یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

انہوں نے مسکرا کر جیب سے وہی کاغذ نکالا جس کی تحریر پوچھتی تھی کہ چچا کی بیٹی کو کیا کہتے ہیں؟ پھر وہ اب بھی لکھا تھا کہ بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن کہتے ہیں۔ لیکن وہ ایسی تحریر تھی کہ باپ کے نام پوسٹ کرنے کے بعد بیٹے اور بھتیجی کا عشق کھائے بغیر سمجھ میں آ جاتا تھا۔

انہوں نے وہ کاغذ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم نے ہی لکھا ہے؟ انکار نہ کرنا۔ رائٹنگ تمہاری نہیں ہے۔ تم نے کسی سے لکھوایا ہے۔ اسے میرے پاس بھیجنے کے لئے تم میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ لفافے پر اپنے ہاتھ سے ایڈریس لکھتے۔ تم نے شاہدہ سے ایڈریس لکھوا کر اسے پوسٹ کرایا۔"

"ابا! آپ... آپ غلط کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ میں نے یہ اسے بتایا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ سے سر تھام لیا۔ اسی وقت امی نے کمرے میں آ کر کہا۔ "شاہدہ گھر سے کھانا لائی ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑا سا ٹفن کیریئر اٹھائے امی کے پیچھے کھڑی تھی۔ ابا مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔ امی سے بولے۔ "ادھر آؤ۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ امی کو باہر لے گئے۔ شاہدہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ کے پاس آئی۔ سرہانے والی میز کے خانے سے برتن اور چمچے نکالنے لگی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا پھر سر جھکا لیا تھا۔ میرا سر ندامت کے احساس سے نہیں اپنی شکست کے خیال سے جھکا تھا۔ اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر اسپتال پہنچایا تھا۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ٹفن کیریئر کھول کر روٹیاں اور سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بول رہی تھی۔ "تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ اسپتال سے گھر آؤ گے تو تمہارے قدموں میں گر جاؤں گی۔ تایا ابا نے میرے ابا کو وہ خط دکھایا ہے جو تم نے لکھا تھا اور میں نے پوسٹ کیا تھا۔ ہمارا رشتہ جلدی پکا ہو جائے گا۔ تم نے اپنی امی اور ابا کی قسم کھائی تھی کہ مجھے اپنے گھر کی عزت بناؤ گے۔"

میں نے دانت پیس کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "میں اور تمہیں گھر کی عزت بناؤں گا۔ مجھے اس حال کو پہنچا کر بھی سمجھتی ہو کہ میں آئندہ بھی احمق بنتا رہوں گا۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "خدا جانتا ہے میں نے ــــ"

میں نے بات کاٹ کر کہا "خدا کو اس میں مت گھسیٹو اور سنو۔ میں پھر اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اسی طرح ذلیل کروں گا کہ سب تمہارے منہ پر تھوکیں گے۔ اسی لمحے سے تمہاری ذلت شروع ہو گی۔ بزرگ سمجھتے ہیں یہ محبت سے لایا ہوا کھانا میں تمہاری موجودگی میں کھاؤں گا۔ نہیں، باہر جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ میں نے تمہارا لایا ہوا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔"

اس کی صورت ایسی ہو گئی تھی جیسے اب تب میں رو پڑے گی۔ میں اس کا رونا دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس پر ترس نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ادھر کوئی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "ہمارے بزرگ راضی ہیں۔ سب کے سب خوش ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں ڈاکٹر نے بھی فوراً شادی کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتی ہوں۔ غصہ تھوک دو۔ میرے منہ پر تھوک دو۔ تنہائی میں خوب انتقام لو مگر مجھے ایک بار اپنا لو۔ میں تمہاری ساری شکایتیں دور کر دوں گی۔"

میں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس نے موسم بہاراں کی

مناسبت سے دھنک رنگ لباس پہنا تھا۔ شاید غسل کرتے ہی گھر سے نکل آئی تھی۔ زلفیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ اگر وہ اور قریب ہوتی تو اس کی سانسوں سے برسات کی بھیگی ہوئی ہوا آتی۔ ہزار نفرت کے باوجود مانتا ہوں کہ بڑے ہی نامعلوم طور طریقوں سے اس کی ضرورت میرے اندر پرورش پاتی رہتی ہے۔

میں نے نظر بچاتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنے دونوں ہاتھ نہ جوڑو۔ میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جوڑو۔ تمہاری التجا کا یہ انداز دیکھ کر آخری سوچ رہا ہوں۔ شرط وہی ہے۔ وعدہ کرو۔ آج رات اسپتال میں تم میرے پاس رہو گی۔"

اس نے بے بسی سے پریشان ہو کر مجھے دیکھا پھر کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہمارے بزرگ کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اجازت نہ ملے تو گھر سے بھاگ کر آ جاؤ۔ کل رات تم نے دھوکا دیا۔ محبوب کی آڑ لے کر مجھے بے وقوف بنایا۔ تم اس کی تلافی کیسے کرو گی؟ یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔"

وہ سوچتی رہ گئی۔ چند لمحوں تک ایسی گم صم رہی جیسے تحلیل ہو چکی ہو۔ پھر وہ بولی۔ "مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ پہلے کھانا کھاؤ۔"

"پہلے کھاتا ہوں لیکن ابھی طے کر لو اور کہو۔ آج کی رات فیصلہ کن ہے۔ میں کل صبح بزرگوں کے سامنے شادی کے لئے ہاں یا نہ کہوں گا۔"

میں بستر سے کھسک کر سرہانے والی میز کے قریب آیا۔ پھر کھانا کھانے لگا۔ وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ "تم میرا مزاج اور سچی محبت کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تمہاری بے جا ضد مان لوں گی تو اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔ میرے اندر کی لڑکی مجھے زندہ نہیں رہنے دے گی۔"

"تم کسی غیر کی نہیں اپنے ہونے والے شوہر کی ضد ماننے والی ہو۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ آؤں گی تو پھر کوئی گڑبڑ ہو جائے گی۔ قدرت کے اشاروں کو اور غائبانہ تنبیہ کو سمجھو۔ ایک رات زخمی ہوئے۔ دوسری رات ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ پتا نہیں تیسری رات کیا ہو جائے گا۔"

"جو ہو گا" اس کی ذمے داری میری ہو گی۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ آج رات تم آؤ گی۔ ورنہ زندگی میں پھر کبھی نہیں آؤ گی۔"

وہ کھانے کے بعد ٹفن کیریئر لے کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی مجھ پر بے چینی سی ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے سکون کی دوائیں دی تھیں۔ میں نے پچھلی رات کو بلا کر بے صبری کی تھی۔ وہ آئی یا نہ آئی لیکن اس کے آنے کا تصور ہیجان انگیز تھا اور یہ ہیجان دواؤں کے منافی تھا۔

اگر میں صبر کر لیتا۔ اسپتال سے چھٹی کے بعد گھر جاتا اور وہاں

ایسی بات ہوتی تو میرے لئے بہتر ہوتا لیکن وہ پہلے سے یہ غلط اندیشہ پیدا کر رہا تھا کہ آج کل میں ہمارا رشتہ طے ہو جائے گا۔ پھر وہ اور سر چڑھ جائے گی۔ اسے آج ہی سر سے اتار کر قدموں میں گرانا لازمی ہو گیا تھا۔

شام چھ بجے تک ابا کو میرے پاس رہنا تھا۔ رات نو بجے امی کے آنے کے بعد وہ گھر جا کر آرام کرتے۔ ایک وارڈ بوائے نے آ کر کہا۔ "آپ کا فون ہے انکل!"

ابا یہ کہتے ہوئے گئے کہ تمہاری ماں کا فون ہو گا۔ ابھی آتا ہوں۔ میں سوچنے لگا۔ امی رات کو میرے پاس رہنے آئیں گی تو شاہدہ نہیں آ سکے گی۔ ویسے بھی ہمارے بزرگ انہیں اسپتال کے کمرے میں رات سے صبح کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ یہ تو میں نے شاہدہ کو پرابلم میں ڈالا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مشکل میں کون سی تدبیر اور حربہ آزمانے کے لئے کیا کر سکے گی۔

ابا نے واپس آ کر کہا "شاہدہ کا فون ہے۔ جاؤ بات کر لو۔"

میں نے بستر سے اتر کر چپلیں پہنیں۔ پھر کمرے سے نکل کر نرس کے کیبن میں گیا۔ ہیڈ نرس نے ایک طرف رکھے ہوئے ریسیور کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا "ہیلو! میں سلمان بول رہا ہوں۔" ہیڈ نرس وہاں سے چلی گئی۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ہوں شاہدہ۔"

"ہاں بولو آنے میں کیا کوئی رکاوٹ ہے؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "آ سکتی ہوں۔ بے خیالی کو آنے جانے کون روک سکتا ہے۔ لڑکی گھر سے بھاگنا چاہے تو ہزار حیلوں بہانوں سے بزرگوں کو چکر دے سکتی ہے۔"

"کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

"میرے پاس خواب آور گولیاں ہیں۔ اپنے والدین اور تمہارے والدین کو دودھ یا چائے میں دو دو گولیاں دے کر صبح تک سلا سکتی ہوں۔"

"میں مانتا ہوں اس قسم کی چالبازیوں میں تمہارا جواب نہیں ہے۔"

"میں نے یہ چالبازی یا شیطانی حرکت اُن راتوں میں نہیں کی جب ہمارے کمرے ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ میں نے راتیں کالی کرنے کے لئے اپنے والدین کو نیند کی گولیاں نہیں کھلائیں۔"

"تم بات لمبی کر رہی ہو۔ آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ خود کو تمہاری امانت سمجھتی ہوں اور شادی سے پہلے امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیا یہی بکواس کرنے کے لئے فون کیا ہے؟"

"یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنا بڑا گناہ کرو گے؟"

"میں گناہگار ہوں اور یہ گناہ تمہارے ساتھ ہوا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"میں یہ بکواس خاندان کے بزرگوں تک پہنچاؤں گا اور صاف کہہ دوں گا کہ ایسی لڑکی شریکِ حیات بننے کے قابل نہیں رہتی جو پہلے ہی کزن کے ساتھ منہ کالا کر چکی ہو۔"

"عمران! کزن! تم اتنا بڑا جھوٹ بولو گے؟ اتنی شرمناک تہمت لگاؤ گے؟"

فون پر امّی کی آواز کانپ رہی تھی۔ شاید وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی یا صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تمہاری نیک نامی کے لیے صرف آج کی رات رہ گئی ہے۔ گناہگار کے پاس آکر عرش کے لیے نیک نام ہو جاؤ یا گناہ سے دامن بچا کر عمر بھر کی بدنامی قبول لو۔"

یہ کہتے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ ابا نے مسکرا کر کہا۔ "شاہدہ تمہارے لیے بڑی پریشان رہتی ہے۔ خیریت پوچھ رہی ہوگی۔"

"خیریت پوچھنے کا تو بہانہ ہے۔ مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟"

"وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے۔ آپ کو برا تو لگے گا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسے بڑوں کا لحاظ اور شرم نہیں ہے۔ ابھی فون پر ضد کر رہی تھی کہ رات کو اسپتال میں رہے گی۔ میں نے پوچھا تمہیں اپنی اور خاندان کی عزت کا خیال ہے یا نہیں۔ ہمارے بزرگ بے غیرت نہیں ہیں کہ جوان لڑکی کو اسپتال میں جوان لڑکے کے پاس چھوڑ دیں۔"

ابا نے شدید حیرانی سے پوچھا "کیا شاہدہ یہاں رات کو آنا چاہتی ہے؟ بیٹے! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

"یقین نہ کریں۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا مگر..."

"مگر وہ بچی نیک اور پارسا ہے۔ ابھی آپ یہاں سے گھر جاتے تو وہ میری خیریت معلوم کرلیتی۔ گھڑی دیکھیں، ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ ایسے میں وہ گھر سے نکل کر کسی پبلک کال آفس میں فون کرنے آئی تھی؟ کیوں اس نے فون کیا؟ اسی لیے کہ مجھ سے یہاں آنے کی ضد کرے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "کوئی بات نہیں بیٹے۔ ابھی بچی ہے۔ نادان ہے۔ یہ بات اپنی ماں سے نہ کہنا۔ وہ تو میرے خاندان والوں سے خار کھاتی ہیں۔ اپنی بہن کی بیٹی سے تمہارا رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"ابا! اوّل تو میں اتنی جلدی... شادی کے خلاف ہوں۔ پھر میں نے قریب رہ کر شاہدہ کے وہ رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں کہ بس... یہ کہاوت کافی ہے کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی۔"

ابا ایک جھٹکے سے یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے منہ پر جوتا پڑا ہو۔ وہ شاہدہ کو بیٹی سمجھتے تھے۔ وہ سگے بھائی کی بیٹی تھی اور اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس پر اتنا شرمناک الزام آیا تو وہ تڑپ گئے۔ بے چینی سے میرے بیڈ کے پاس ٹہلنے لگے۔ پھر میرے سامنے رک کر بولے۔ "شاہدہ کی بدنامی میری، تمہاری اور پورے خاندان کی بدنامی ہے۔ اس سلسلے میں میری دو باتیں یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ یہ الزام جھوٹا نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ الزام جھوٹا ہو یا سچا، یہ بات اسپتال کے اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ اب بتاؤ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ہماری بیٹی میں کوئی خرابی دیکھی ہے۔ اگر نہیں دیکھی تو کوئی ثبوت یا گواہ ہے۔ اگر ہے تو ابھی پیش کرو۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابا شاہدہ کو اس قدر غیرت کا مسئلہ بنالیں گے۔ جب وہ گناہگار نہیں تھی تو میں اس کے خلاف ثبوت اور گواہ کہاں سے لاتا؟ انہوں نے پوچھا "تم نے مجرموں کی طرح سر کیوں جھکا لیا ہے؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کے سامنے جھکا ہوا سر مجرم کا نہیں گناہگار کا ہے۔"

ابا کو پھر ایک شاک پہنچا۔ وہ ایک قدم پیچھے گئے پھر بولے۔ "گناہگار تم؟"

میں بدستور سر جھکائے بیٹھا تھا اور اپنی خاموشی کو اقرار بنا رہا تھا۔ تہذیب اور شرم کے پردے میں رہ کر کہہ رہا تھا کہ گناہگار ہی اپنے اور اس کے گناہ کا چشم دید گواہ ہوتا ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ تڑپ کر میری طرف آئے اور ایک زوردار طمانچہ میرے منہ پر رسید کردیا۔ "ذلیل! کمبخت! تم عبادت کرتے ہو۔ خدا کا کلام پڑھتے ہو۔ پورے خاندان میں فرشتہ کہلاتے ہو اور تم نے ایسی حرکت کی۔ تم میرے بھائی کے گھر میں کھاتے رہے اور میرے بھائی کے گھر میں تھوکتے بھی رہے۔ ایک کتا بھی مالک کے گھر میں پیشاب نہیں کرتا۔ تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔"

وہ زور زور سے سانسیں لے رہے تھے جیسے اپنے اندر بیٹے کی محبت سے کشتی لڑ رہے ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے گولی مار دیتے۔ وہ بڑی شدت سے ٹہل رہے تھے۔ کبھی بیٹھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں اپنے خون کے گھونٹ پی رہا ہوں کہ گھر کا معاملہ ہے۔ بیٹے اور بھتیجی کی غلطی ہے۔ اسپتال سے چھٹی ہوتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھا کر اس غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ بازی میرے خلاف ہوگئی تھی۔ میں اپنے اوپر حاوی رہنے والی لڑکی کو شریکِ حیات نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں نے سر جھکا کر کہا "ابا! میں شادی نہیں کروں گا۔ امی بھی اسے بہو نہیں بنائیں گی۔"

انہوں نے آنکھیں نکال کر تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے کہا "خبردار! اپنی امی سے ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے شاہدہ

پر داغ لگتا ہو۔ تمہاری ماں یہ بدنامی اپنے میکے والوں میں پھیلا دے گی۔"

"ابا! یہ شادی میری بربادی ہوگی۔"

"بربادی ہونے دو۔ میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ایک تو یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شاہدہ کا پلڑا کیسے بھاری ہو جاتا تھا۔ میں جدھر سے اس پر حملے کرتا تھا ادھر سے مات کھاتا تھا۔ وہ سنجیدہ، باوقار اور شرم والی تھی۔ میں اس کی شخصیت کو مسخ کرنے میں ناکام رہتا تھا اور یہ باتیں خطرے کی گھنٹی بجاتی تھیں کہ شادی کے بعد وہ ہر پہلو سے مجھ پر حاوی رہے گی۔

انہوں نے کہا۔ "میں کل صبح ڈاکٹر سے کہوں گا کہ تمہیں چھٹی دے دے۔ میں جب تک تمہاری شادی نہیں کراؤں گا مجھے سکون نہیں ملے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکوں گا۔"

"آپ ابھی سے کیا جلدی ہے ابا؟ میری تعلیم تو مکمل ہونے دیں۔"

"مجھے تعلیم سے زیادہ تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔ میں نہیں چاہتا تمہارے ساتھ بھی وہی ہو جو تمہارے دادا کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کی موت پاگل خانے میں ہوئی تھی۔ تمہاری دادی کی وفات کے بعد وہ ایک عورت کے دیوانے ہوگئے تھے۔ انہوں نے اس پر دولت لٹائی تاکہ وہ شادی کرلے لیکن اس نے دور ہی دور سے انہیں دیوانہ بنا کر پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔"

یہ تو میں جانتا تھا کہ دادا پاگل ہوگئے تھے لیکن یہ اب پتا چلا کہ انہیں ایک عورت نے پاگل بنا دیا تھا۔ اگر مجھے پہلے ان کے پاگل پن کی وجہ بتائی جاتی تو میں اسے دادا جان کی حماقت کہتا۔ بھلا عورت بھی کوئی چیز ہے جس کے لیے پاگل ہوا جائے۔ لیکن اب ذاتی تجربات سے تسلیم کر رہا تھا کہ عورت کس طرح رفتہ رفتہ ہمارے اندر سرنگ بناتی ہے اور ہماری پہلی اور آخری ضرورت بن کر حواس پر چھا جاتی ہے۔ وہ ملے تو ہم ہوشمند، نہ ملے تو دیوانے ہو جاتے ہیں۔

میں اوپر سے کزن کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اسے شریکِ حیات نہیں بنانا چاہتا تھا لیکن اندر سے اس کی ضرورت پکار رہی تھی۔ ابھی تو امی اور ابا کی موجودگی نے مجھے نارمل بنایا ہوا تھا۔ یہ نہ ہوتے اور تنہائی میں وہ ہوتی اور اس پر میری حکمرانی نہ چلتی تو میں پھر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا اور اسپتال کے بجائے پاگل خانے پہنچا دیا جاتا۔

خاندانی پس منظر اور موجودہ حالات کے مطابق عقل یہی سمجھاتی تھی کہ شادی جلد ہو جائے اور میں دادا جان کی تاریخ نہ دہراؤں اور یہ طے کرلوں کہ شادی کے بعد کس طرح شاہدہ کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنا ہے۔ فوری طور پر یہی بات عقل میں آئی کہ اسے نظروں سے گرا کر اپنی زندگی میں لایا جائے۔ میں نے کہا "ابا! میں آپ کی ہر بات مان لوں گا۔ آپ میری ایک بات مان لیں۔"

"بات معقول ہوگی تو ضرور مانوں گا۔"

"آپ ہمارا رشتہ پکا کرنے سے پہلے مجھ کو اور شاہدہ کو لعن طعن کریں۔ میرے ساتھ اسے بھی احساس دلائیں کہ ہم نے بزرگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"شاباش بیٹے شاباش! تمہارے یہ احساسات اور خیالات سن کر دل خوش ہو گیا۔ میں شاہدہ کو اس سلسلے میں ضرور ڈانٹوں گا۔"

مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ میں نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اس کی پارسائی کے غرور کو خاک میں ملاؤں گا۔ وہ اپنی ذات میں لاکھ پارسا ہے لیکن اس کا دامن داغدار اور آنچل تار تار دکھائی دیتا رہے گا۔

پھر یہی ہوا۔ اس رات ابا نے گھر جا کر چچا اور چچی کو ہماری غلطی کے متعلق بتایا۔ میں وہاں تماشا دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھا لیکن تصور کرسکتا تھا کہ چچا کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ چچی نے بیٹی کی پٹائی کی تھی۔ وہ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہی تھی کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد رہتی آئی ہے لیکن کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ مجھ جیسا فرشتہ کہلانے والا خود کو اس کے ساتھ گناہگار ٹھہرا رہا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا انکار اور اس کی قسمیں بے وزن ہو کر رہ گئی تھیں۔

دوسری صبح پانچ بجے وہ منہ اندھیرے اسپتال کے کمرے میں آئی۔ امی میرے بیڈ کی پائنتی پر سکڑ کر سو رہی تھیں۔ اس کی آواز سن کر اٹھ بیٹھیں۔ شاہدہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "چلو اٹھو یہاں سے اور مسجد میں چلو۔ میں تمہارا ایمان دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم خدا کے گھر میں بھی جھوٹ بول سکتے ہو یا نہیں؟"

میں ایک دم سے بوکھلا گیا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بزرگوں کا خوف اور لحاظ بھول کر یوں چڑھ دوڑے گی۔ امی نے گھور کر پوچھا "شاہدہ! بات کیا ہے؟ تم میرے بیٹے کو مسجد کیوں لے جاؤ گی؟"

"یہ آپ اپنے بیٹے سے پوچھیں۔"

"میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں۔ اتنی صبح اکیلی آئی ہے۔ گھر سے منہ اندھیرے نکلی ہوگی۔ کیا میرے بیٹے کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے آئی ہے؟"

"آپ نے درست سمجھا ہے۔ یہ ابھی میرے ساتھ مسجد میں جائے گا۔"

"کیسی بدتمیزی سے بول رہی ہے۔ یہ تجھ سے عمر میں بڑا ہے۔"

وہ بولی "اپنی ماں کو بتاؤ تم کرتوت میں شیطان سے بھی بڑے ہو۔"

میں نے کہا۔ "امی! آپ خاموش رہیں۔ یہ غصے میں ہے۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔"

"بیٹے! تم اس لڑکی کے فیصلے سے ڈر رہے ہو؟"
وہ بولا۔ "ڈرنے کی بات ہے۔ اس لیے ڈر رہا ہے۔"
وہ بولے اٹھ کر جیبیں پہنتے ہوئے بولیں۔ "آخر بات کیا ہے۔ یہ شیطان بن کر گھر سے یوں فرار کیوں آئی ہے اور ابھی سر جھکا کر کیوں چل رہی ہے؟"

اسی وقت چاچی، چاچا اور ابا تیزی سے چلتے ہوئے آئے۔ انہوں نے شاہد کو دیکھا۔ پھر مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دکھا کر کہا "شاہدہ یہ پرچی گھر میں لکھ کر آئی ہے کہ یہ ابھی تمہیں سمجھ میں لے جانے کے لیے اسپتال جا رہی ہے۔"

چاچی نے بیٹی سے کہا "تجھے پرچی لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا یہاں آنے کے لیے ہم سے نہیں کہہ سکتی تھی؟"

"آپ لوگوں سے کبھی تو یوں آنے کی اجازت نہ ملتی۔ ان صاحبزادے کو مجھ پر اور زیادہ کیچڑ اچھالنے اور اپنا بچاؤ کرنے کا موقع مل جاتا اور مجھے حاضر کرنے میں جتنی دیر ہوتی اتنی دیر تک یہی ڈاکٹر کے سے خیال میں میرے امی ابا کا کلیجہ چھلنی ہوتا رہتا۔"

میرے ابا نے کہا "بیٹی! اور ابھی تو اور میں نہ بولو۔ اسپتال والے تنگ ہو جائیں گے۔"

"ہونے دیں۔ جب میں بدنام ہو رہی ہوں تو سب ہی بدنام ہوں گے۔ آپ کو خاندان کی عزت اور غیرت کا اتنا ہی خیال ہے تو بیٹے کو ابھی سمجھ میں لے چلیں۔"

ابا نے مجھ سے کہا۔ "اٹھو یہ جہاں کہتی ہے وہاں چلو۔"

میں مشکل میں پڑ گیا۔ اسپتال یا گھر میں باتیں ہوتیں تو میں سوچتا تھا سنبھال کرا لے۔ بھولی اور یہ کار وابت کر دیتا لیکن میں نے تو پہلے ہی اس کے متعلق رائے قائم کر لی تھی کہ یہ موقع گھٹنوں میں ٹیکنے والی لڑکی ہے۔ اب یہ مجھے اللہ کے گھر میں پکڑنے لے جا رہی تھی۔

یہ درست ہے کہ بے ایمان عدالتوں میں کلام پاک اٹھا کر اور سمجھ میں قسمیں کھا کر بھی جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں لیکن میری گھٹی میں اللہ کا خوف تھا۔ اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ میں سمجھ جانے کے لیے بستر سے نہیں اٹھا۔ مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ابا نے کہا۔ "تم نے سنا نہیں؟ یہاں سے اٹھو اور چلو۔"

امی نے کہا۔ "یہ آپ لوگ میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

ابا نے کہا "صبر کرو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

میں بیڈ سے اتر کر امی کے پیچھے آ گیا۔ ان کے پاس چھپ کر بولا "امی! میں آپ کے پاس رہوں گا۔ ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

ابا نے کہا "بچہ ماں کی گود میں چھپ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم جھوٹ بول رہے تھے۔ معصوم شاہدہ پر شرمناک الزام لگا رہے تھے۔ یہ شیطان تمہارے اندر کیوں پیدا ہوا؟"

چاچا نے پوچھا۔ "میں نے تمہیں بیٹا بنا کر رکھنے میں کوئی کمی کی تھی؟"

چاچی نے کہا "بیٹے! ایسی دعائیں دو جو بلا کر آتی ہیں۔ میں تو دعائیں مانگ مانگ کر تمہیں پالتی رہی۔"

شاہدہ نے کہا "امی! آپ اسے بیٹا نہ کہیں۔ کیونکہ یہ میرا بھائی کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ مجھ پر تہمت لگانے والا میرا مجازی خدا بھی نہیں بن سکے گا۔ اگر یہ میرے گھر میں قدم رکھے گا تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

ابا نے کہا۔ "بیٹی! غصہ برداشت کرو۔ میں مانتا ہوں تمہاری انا کو مجروح کیا گیا ہے لیکن یہ ہمارے گھر کے اندر کا معاملہ ہے۔ جو بات بگڑ چکی ہے اسے ہم بنائیں گے۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا، ایسی سزا دوں گا کہ..."

شاہدہ نے کہا۔ "نہیں، آپ میں سے کسی کی بھی دی ہوئی سزا اسے کم پڑے گی۔ سزا میں دے رہی ہوں۔"

ابا نے کہا "میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔"

چاچا نے کہا۔ "بیٹی! بات ختم کرو۔"

"کیا میری بے گناہی ثابت نہ ہوتی تو بات ختم ہو جاتی؟ کیا مجھے پولیس ہا کرنے جانے سے بدکاری کا داغ مٹ جاتا۔ بیٹی باپ کے گھر سے ہزاروں لاکھوں کا جہیز لے کر جاتی ہے لیکن ماں کی تربیت بیٹی کی بے داغ آبرو جہیز میں دیتی ہے۔ اس جھوٹے الزام کے بعد میری ماں کے پاس بیٹی کو دینے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔ یہ شخص مجھے بیوی بنانے کے بعد تمام رشتے داروں اور دوستوں میں اسی طرح ذلیل کرتا جیسے شادی سے پہلے کر رہا ہے۔ کل ہی اس نے فون پر مجھے ذلیل اور رسوا کرنے کا چیلنج کیا تھا۔"

سب نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ابا نے پوچھا "تم نے ایسا چیلنج کیوں کیا تھا؟"

میں امی کے پیچھے ان سے لپٹا ہوا تھا۔ وہی میرا مضبوط سہارا تھیں۔ میں نے کہا۔ "امی! ڈاکٹر نے کہا ہے مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے امی!"

وہ بولیں "میرے بیٹے کو آرام کرنے دیں۔ کیا آپ اسے پاگل بنانا چاہتے ہیں؟"

ابا نے کہا۔ "میں شاہدہ سے آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ کیا اس مکار فریبی لڑکے کو معاف کرے گی؟ اگر نہیں کرے گی تو آج سے میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔"

"مجھے افسوس ہے تایا ابا! میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی لیکن ایک درخواست کروں گی۔ جانے سے پہلے آخری بار آپ کے بیٹے سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

ابا نے چاچا کو دیکھا۔ چاچا نے کہا۔ "بھائی جان! آپ بڑے ہیں۔ ہمیں اپنی بیٹی پر اعتماد بھی ہے اور فخر بھی۔"

امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ میرے بیٹے سے تنہائی میں کیا کہنا چاہتی ہے؟ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

ابا نے کہا۔ "سیدھی طرح باہر چلو اور دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

میں نے کہا۔ "امی! آپ جائیں۔ فکر نہ کریں۔"

امی دوسرے تمام بزرگوں کے ساتھ کمرے سے جانے لگیں۔ میں بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی۔ پھر اس کے دونوں پٹ بند کر کے فاتحانہ شان سے میری طرف گھوم گئی۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ کبھی وہ نظریں جھکا لیا کرتی تھی۔ اب جھکانا اور شرمانا بھول گئی تھی۔ اس نے کہا "یہ پرانی کہاوت ہے کہ بد اچھا بدنام برا۔ اگر ہمارے درمیان بدی ہوتی تو شاید میں اسے برداشت کر لیتی لیکن تم نے بدنام کر کے بڑی کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ اسے میں برداشت نہیں کروں گی۔ تم نے ناجائز طریقوں سے مجھے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اب جائز طریقے سے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔" وہ غصے کے انداز میں چلتی ہوئی میرے بیڈ کے ایک طرف سے دوسری طرف آئی۔ پھر بولی۔ "میں پھر اکیلی تمہارے کمرے میں ہوں۔ مرد کے بچے ہو تو میرا ہاتھ پکڑو۔"

اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ "تم گھبرا رہے ہو اس لیے کہ بزرگوں کا اعتماد تم پر سے اٹھ گیا ہے اور میں بھرپور اعتماد حاصل کر کے آئی ہوں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ اگر میں ہاتھ پکڑ لیتا اور وہ چیخ مارتی تو بزرگ کبھی یقین نہ کرتے کہ اس نے ہاتھ پیش کیا تھا۔ مجھے پھر ایک بار شیطان تسلیم کیا جاتا۔ وہ بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ وہی گورے گورے چکنے ہاتھ ہیں۔ یہی گورا بدن تمہارے سامنے بارش میں بھیگتا رہا تھا اور تم مرچوں کی برسات میں بھیگتے رہے تھے۔ کیسی کم بختی ہے کہ صرف خیالی مرچیں لگتی ہیں۔ وہ خواب سرچیں تعبیر بن کر تمہاری تنہائی میں آتی ہیں اور تم اس جیتی جاگتی تعبیر کو پکڑ نہیں سکتے اور جب نہیں پکڑ سکتے تو دیوانے ہو جاتے ہو۔ چیختے چلاتے ہو اور دیواروں سے ٹکریں مارتے ہو۔ آج آخری بار یہ بدن تمہارے پاس آیا ہے۔ آج کے بعد تمہاری زندگی میں بہت سی شاہدائیں آئیں گی لیکن بدن کا یہ تاج محل کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ جسے تم نے میرے گھر کا تنکا کھا کر دن رات دیکھا ہے۔ میری ماں کی گود میں سر رکھ کر مجھے ڈھونڈا ہے۔ میں تب بھی تمہیں نہیں ملی اب بھی نہیں مل رہی ہوں۔ میں جا رہی ہوں۔ آج کے بعد میرے دل سے جتنی بددعائیں نکلیں گی وہ سب تمہارے لیے صرف تمہارے لیے ہوں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکل گئی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے جی میں آیا زور زور سے چیخ چلاؤں۔ اسے چیخ چیخ کر گالیاں دوں، دوڑ کر جاؤں اور واپس کھینچتے ہوئے کمرے میں لا کر اس کا لباس تار تار کر دوں۔ اس کی پارسائی کی دھجیاں اڑا دوں۔ میرے اندر ایسا کر گزرنے کی تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ میں زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ جیسے درندہ اپنے شکار تک نہ پہنچنے کے باعث بے چین ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی میں بستر پر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک مسکن دوا دی تھی اور تاکید کی تھی کہ جب ذہنی انتشار بڑھے اور یہ محسوس ہو کہ دماغی طور پر بے قابو ہونے والے ہو تو وہ دوا کھا لینا۔ میں نے سرہانے کی میز سے وہ دوا اٹھائی۔ گلاس میں پانی لیا پھر دو گولیاں نگل لیں۔

فوراً ہی سکون نہیں ملا مگر اتنا تو پیدا ہوا کہ نارمل رہوں گا۔ وہ مجھے پاگل بنانا چاہتی ہے لیکن میں اس کے اشتعال دلانے سے مشتعل ہونے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد میں سیدھا لیٹ گیا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

چونکہ میرے اندر ہیجان رہا ہوا تھا۔ غبار نکلا نہیں تھا اس لیے گہری نیند نہیں آئی۔ میں نیم خوابیدہ سا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ سپنا تھا، میری سوچ تھی یا میرے بھوکے ارادے تھے جو بند آنکھوں کے پیچھے پورے ہو رہے تھے۔ سبز باغ اسے کہتے ہیں جو تصور میں دکھایا جاتا ہے۔ حقیقتاً اس کا وجود نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بدن کا سبز باغ دکھا گئی تھی۔ میں اسے چھونا چاہتا تھا۔ وہ ٹرانسپیرنٹ ہو جاتی تھی یعنی شیشے کی طرح آر پار دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہاتھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ خوشبو تھی مگر سونگھنے سے پہلے ہی اڑ جاتی تھی۔ وہ سب رنگ تتلی تھی اپنے پیچھے دوڑاتی تھی۔ اسی دوڑ بھاگ کے دوران کاندھا جھنجھوڑا تو میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

میری امی مجھے جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھیں۔ "کیا ہوا بیٹا؟ آنکھیں کھولو۔"

امی اور اسپتال کو دیکھ کر اطمینان ہوا کہ خواب میں نہیں بھٹکتا۔ ہاں بھٹکا نہیں بھٹکی ہوئی تھی۔

امی نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ ابا وغیرہ کہاں ہیں؟"

"وہ چلے گئے۔ تمہارے باپ کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ ایسی حالت میں تجھے چھوڑ کر بھتیجی کے ساتھ گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ اسپتال سے چھٹی کرا کے تمہیں حویلی لے جاؤں۔"

"امی! میں یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تعلیم ادھوری نہیں چھوڑوں گا۔"

"چولہے میں گئی تمہاری تعلیم۔ ابھی نیند میں کتنا کتنا پکار رہے تھے۔ کیا یہی ہے تمہاری تعلیم؟"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کس کتن کو پکار رہا تھا؟"

"کسی کتن کو نہیں امی کو ... اتفا۔ میں امی بھی جاہل نہیں

کنٹرول ہوتا جس کے ذریعے میں شاہدہ کو بار بار ری وائنڈ کر کے دیکھ سکتا۔ میں نے بعض مناظر کئی بار اس لئے دیکھا کہ ہیروئن کی جگہ شاہدہ نظر نہیں آرہی تھی جبکہ ہر لڑکی میں اس کا روپ دکھائی دیا کرتا تھا۔ اب میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔ ری وائنڈ کرتا تھا شاید اب کی بار دکھائی دے لیکن وہ ایسی گم ہو گئی تھی جیسے میری آنکھوں کو اپنے دیدار سے اندھا کر دیا ہو اور اس اندھے پن کو مقدر بنا دیا ہو کہ میں آئندہ کبھی اسے دیکھ نہیں سکوں گا۔

دیکھتے دیکھتے ری وائنڈ کرتے کرتے میں یکبارگی پھٹ پڑا۔ چیخ کر بولا "کہاں مر گئی ذلیل کمینی! دکھائی کیوں نہیں دیتی؟"

وہ چاروں ایک دم سے اچھل پڑے۔ رات کے دو بج گئے تھے۔ ان میں سے کوئی سو رہا تھا کوئی اونگھ رہا تھا۔ وہ ایسی فلمیں دیکھنے کے عادی تھے اس لئے ضعف پیدا ہو رہا تھا۔ میرے چیخنے پر وہ گھبرا کر میری طرف لپکے "کیا ہوا؟ کس سے بول رہے ہو؟"

"وہ... وہ" میں نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ چاروں میرے آس پاس تھے۔ ایک نے میرے سر پر آئس بیگ رکھا تھا۔ دماغ کو ٹھنڈک پہنچ رہی تھی۔ وہ مجھے میرے بستر پر لے آئے تھے۔ میں نے کہا۔ "یہ ساتھ والی دراز میں سکون کی دوائیں ہیں۔"

انہوں نے مجھے وہ دوائیں کھلا دیں۔ میں تھوڑی دیر بعد سو گیا لیکن ان کی نیندیں اڑ گئیں۔ میں سو گیا۔ وہ جاگتے رہے اور مجھے مصیبت سمجھ کر آپس میں مشورے کرتے رہے۔ میں ابتدا میں ان سے دور بھاگتا تھا۔ اب انہیں دوست اور ہمدرد سمجھنے لگا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ مجھے کس طرح مزید پاگل بنا دینے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

وہ چاروں دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے نقصان پہنچا کر کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے۔ اس لئے قرضوں میں جکڑے رہتے تھے۔ ان دنوں انہیں بیس ہزار روپے کی سخت ضرورت تھی۔ یہ رقم وہ جوئے میں ہار گئے تھے اور ادائیگی کے لئے ایک ہفتے کی مہلت حاصل کی تھی۔ مہلت بھی اس لئے انہیں مل گئی تھی کہ قاسم نے اپنی دو لاکھ کی کار گروی رکھی تھی۔ اگر وہ سات دنوں کے اندر بیس ہزار روپے ادا نہ کرتے تو دو لاکھ کی کار چلی جاتی۔

انہیں امید تھی کہ وہ چاروں اپنے اپنے والدین سے پانچ پانچ ہزار لا کر بیس ہزار کا قرض ادا کر دیں گے لیکن قاسم کا باپ بیرون ملک کے دورے پر چلا گیا تھا۔ محمود کے باپ نے اتنا ڈانٹ کر کہہ دیا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے ہر ماہ دس ہزار روپے خرچ کرنے لگا ہے اور مزید پانچ ہزار لینے آیا ہے۔ اسی طرح باقی دو دوست بھی ناکام رہے تھے۔ وہ تھوڑی رقم ضرور لائے تھے لیکن دوسرے قرض خواہوں نے وہ رقم چھین لی تھی۔ اس رات میں منگنی ... دوا کھا

کر سو گیا تو ایک نے کہا "یہ کوئی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی۔"

انہوں نے میری جیب سے چابی نکال کر اٹیچی کھولی۔ اس کی تلاشی لی۔ کپڑوں کے نیچے سے ستائیس ہزار روپے نکلے۔ ان کی تو عید ہو گئی۔ ابا نے مجھے دس ہزار روپے دیے تھے لیکن امی نے ان سے چھپا کر بیس ہزار روپے اٹیچی میں رکھ دیے تھے۔ کل تیس ہزار میں سے میں نے تین ہزار خرچ کئے تھے باقی ان چاروں کے ہاتھ لگ گئے۔

انہوں نے اٹیچی کو پہلے کی طرح لاک کیا۔ چابی میری جیب میں رکھی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں آ گئے۔ قاسم نے کہا۔ "میں کل ٹیکسی میں بیس ہزار ادا کر کے اپنی کار لے آؤں گا۔"

اسلم نے پوچھا "کل اس نے اپنی اٹیچی کھولی تو کیا ہو گا؟"

قاسم نے کہا۔ "ہم سب اپنے اپنے کمرے سے ایک ایک قیمتی چیز غائب کر دیں اور سلمان کے کمرے سے اس کی اٹیچی کو غائب کیا جائے۔ اس طرح یہ تاثر دیا جائے کہ کوٹھی میں ڈاکو آئے تھے۔"

ایک نے چٹکی بجا کر کہا "زبردست آئیڈیا ہے۔"

"یہ آئیڈیا کامیاب ہو جائے تو اس پاگل کو بھی کسی بہانے یہاں سے نکال دینا چاہئے۔"

"یہ تو پاگل ہو کر خود ہی یہاں سے چلا جائے گا۔"

"اس کا باپ بھی جانے گا۔ ہم اس کے ساتھ کچھ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کریں گے کہ یہ یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

دوسری صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ میں قدرے سکون محسوس کر رہا تھا۔ سوچا غسل کر کے لباس تبدیل کروں۔ تب معلوم ہوا کہ اٹیچی غائب ہے۔ میں نے قاسم کے کمرے میں آ کر اسے جگایا اور اپنی اٹیچی کے متعلق پوچھا۔ اتنے میں محمود نے آ کر کہا "یار قاسم! میری الماری کھلی ہوئی ہے۔ میری سونے کی انگوٹھی، گھڑی ہیں اور چھ ہزار روپے غائب ہیں۔"

قاسم نے پوچھا "تم نے الماری کو لاک نہیں کیا تھا؟"

وہ بولا۔ "تم تو جانتے ہو۔ رات دو بجے تک سلمان کا ذہنی توازن بگڑا رہا۔ ہم اسے سنبھالتے رہے۔ جب یہ سو گیا تو ہم نے خوب پی لی۔ ایسے میں الماری لاک کرنا کسے یاد رہتا ہے۔"

"بھئی یہ سلمان کہہ رہا ہے اس کی اٹیچی غائب ہے۔"

"اس کا مطلب ہے رات چور آئے تھے۔ تم اپنے کمرے کی تلاشی لو۔"

کمرے کی چیزیں دیکھنے پر معلوم ہوا ایسی ہی چوری ہو گئی ہے۔ ریاض اور اسلم نے بھی بتایا کہ نقد رقم، سونے کی منگنی اور گھڑی وغیرہ چوری ہو گئی ہیں۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے ساتھ وہ چاروں بھی لٹ گئے ہیں۔ میں نے کہا "ہمیں پولیس کو اطلاع کرنا چاہئے۔"

قاسم نے کہا "ہم سے پوچھا جائے گا کہ چور آئے تھے تو ہم پانچوں کیسی نیند کیسے سو رہے تھے۔ کسی ایک کو تو آہٹ سن کر جاگنا چاہئے تھا۔ کیا ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے بہت زیادہ نشہ کیا تھا؟ سب کے سب خواب آور گولیاں کھا کر سو گئے تھے۔ پھر چوری کی رپورٹ سے ملتا کیا ہے؟ مال تو کبھی نہیں ملتا۔ کچھ بچا کھچا مال مل بھی جائے تو اس سے زیادہ تھانے پولیس کے چکر میں رقمیں خرچ ہوتی رہتی ہیں۔ بات عدالت تک پہنچے تو جوتیاں چٹختی رہتی ہیں۔"

ان سب نے مل کر مجھے قائل کر دیا کہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ قاسم نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "میرے دوست! ہمیں اپنی چوری کا غم نہیں ہے۔ شرمندگی یہ ہے کہ تم مہمان بن کر آئے اور لٹ گئے۔ میں تم کو کتنا کہتا ہوں کہ میں کسی طرح بھی خون پسینہ ایک کر کے تمہارے ستائیس ہزار ادا کروں گا۔"

میں نے کہا "قاسم بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تم سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ یہ واردات ہم سب کے ساتھ ہوئی ہے۔ مجھے رقم کے جانے کا اتنا افسوس نہیں ہے۔ آج نہ لٹتیں کل کو ... جاؤں گا تو تم نے ... مجھے تو یہ شرمندگی ہے کہ پچھلی رات میرے پاگل پن کے باعث تم لوگوں کو پریشانی ہوئی۔"

"پریشانی اس لئے نہیں ہوئی کہ تم بوجھ ہو۔ ہاں تمہارے پاگل پن سے ہم پریشان ہوئے اور تشویش میں مبتلا ہو کر سوچتے رہے کہ اتنے پیارے دوست کو یہ کیا روگ لگ گیا ہے۔ یہ غم غلط کرنے کے لئے ہم نے زیادہ پی لی تھی۔"

محمود نے کہا "ہم تمہارا علاج کرتے رہیں گے۔ اگر تمہیں ہماری دوستی پر بھروسہ نہیں ہے تو انکار کر دو۔ ورنہ ہم جیسا کہتے جائیں تم عمل کرتے جاؤ۔ پھر تم کو کبھی ایسا دورہ نہیں پڑا کرے گا۔"

قاسم اپنی کار واپس لے آیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کار گروی میں پھنسی ہوئی تھی۔ محمود نے قاسم کے کمرے سے وی سی آر لے جا کر دکاندار کو دیا تھا اور دو ہزار روپے کے بدلے میں وہ دوسرا وی سی آر لے آیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ صرف تین ہزار ادا کر کے وہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا کہ اب وی سی آر پر فلمیں نہیں دیکھوں گا۔ دماغ قابو میں نہیں رہتا ہے۔ مجھے یہ بات یاد آئی تھی کہ میرے دادا کو بھی کسی عورت نے دیوانہ بنا کر پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔ ایک پاگل حسینہ میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہا تھا میں اپنی رگیں کاٹ کر نہیں پھینک سکتا تھا۔

میں وی سی آر پر فلمیں نہ دیکھنے کے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا۔ انہوں نے میرا علاج کرنے کے بہانے ایک چال چلی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں قاسم کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "کل میں چند جاؤں گا اور ابا سے کہہ دوں گا کہ رقم لٹ گئی ہے۔"

اسی وقت باہر برآمدے میں قدموں کی آواز آئی۔ قاسم نے مسکرا کر کہا "محمود گیا ہے اور تمہاری شاہدہ کو لایا ہے۔"

ایک دم سے میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا "شاہدہ؟ ... میری کزن؟"

اسی وقت کمرے کے باہر چھم چھم کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ قاسم نے کہا "وہ تمہاری کزن ہے یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتا۔ ہاں محمود نے بتایا تھا کہ کسی شاہدہ کو لانے والا ہے۔"

دروازہ کھلا۔ چھم چھم کی آواز واضح ہو گئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر دوپٹے کا نصف گھونگٹ تھا اس لئے صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں کی اصلی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ بہت حسین ہے۔ تنگ پاجامے اور ململ کے کرتے میں اس کی گت مہندی دیکھ کر دل گواہی دے رہا تھا وہ شاہدہ ہے۔

محمود اس کا ہاتھ تھام کر کمرے کے دوسرے دروازے سے کاریڈور میں گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن دور تک اور دیر تک پازیب کی چھم چھم پکارتی رہی۔ پھر محمود نے واپس آ کر مجھ سے کہا۔ "میں نے اسے تمہارے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔"

"میرے کمرے میں؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا "لیکن وہ ...؟"

قاسم نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں نہ جانا چاہو تو میرے بستر پر سو جانا۔ بھئی ریاض! فلم چلاؤ۔"

ریاض وی سی آر کے پاس گیا۔ محمود نے کہا "سلمان! تم نے بتایا تھا کہ جس رات بارش میں تمہاری کزن بھیگ رہی تھی اس وقت اس نے ململ کا کرتا اور تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ آج بھی شاہدہ وہی لباس پہن کر آئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتاؤ یہ شاہدہ کون ہے؟"

قاسم نے کہا۔ "یار! تم تو جا کر دیکھو۔ فلم شروع ہو گئی ہے۔ ہمیں دیکھنے دو۔"

میں اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ نہیں جانا چاہتا تھا مگر جا کر دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ جانا چاہتا تھا سارا بدن کہہ رہا تھا "میں وہی ہوں۔ ہاں میں وہی ہوں۔"

سامنے اسکرین پر رنگین اور سنگین نظارے تھے اور نظروں میں ململ سے جھلکتا بدن تھا۔ آنکھیں ادھر تھیں دھیان ادھر تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا۔ وہاں بیٹھا رہا تو پھٹ پڑوں گا۔ میں ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے نظر انداز کیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے لڑکھڑایا۔ ریاض نے گرنے سے پہلے مجھے سنبھال لیا۔ قاسم نے کہا۔ "اسے کمرے میں پہنچا کر آجاؤ۔"

سوچا جائے تو نشہ کسی چیز میں نہیں ہوتا۔ احساس میں ہوتا ہے۔ احساس کرنے والا ایک گھونٹ پی کر بہک جاتا ہے اور بے حس پینے والا پوری بوتل حلق سے اتار کر اپنے پیروں پر کھڑا رہتا

ہم کے ساتھ نہ لیں۔ ورنہ آپ سے بھی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔"

امی نے اپنا دامن پھیلا کر کہا "پچھلی غلطیوں پر خاک ڈالنے کی کوئی صورت نکالو۔ ہم عمر میں اور رشتے میں تم سے بڑے ہیں۔ پھر بھی تمہارے آگے جھک رہے ہیں۔"

"بھائی! آپ جھکتے جھکتے ٹوٹ جائیں گی۔ پھر بھی وہ ذلیل اور کم ظرف میرا داماد نہیں بنے گا۔"

ابّا نے پوچھا "ایسی کیا قیامت ہو گئی ہے کہ معافی اور توبہ کا کوئی دروازہ ہی نہیں کھل سکتا؟"

چاچا نے کہا "آپ دیکھنا اور سننا ہی چاہتے ہیں تو ابھی دکھاتا اور سناتا ہوں۔"

انہوں نے اپنی الماری کھول کر کچھ کاغذات نکالے۔ پھر ایک ایک کاغذ میرے ابّا کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ دیکھیں اور یہ دیکھیں اور یہ پڑھیں۔ آپ کے بیٹے کے دوستوں نے ڈاک کے ذریعے میری بیٹی کو یہ خط لکھے ہیں۔ یہ ایسے خطوط ہیں جنہیں فوراً جلا دینا چاہئے لیکن میں نے ثبوت کے طور پر رکھا ہے کہ آپ کا وہ کم ظرف بیٹا کیسی کیسی محفلوں میں میری بیٹی کی بے حیائی کی باتیں کرتا ہے۔"

ابّا نے وہ خطوط پڑھ کر ندامت سے سر جھکا لیا۔ امی نے کہا "تمہارے بیٹے نے کمینگی کی انتہا کر دی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ شاہدہ ہمارے خاندان کی غیرت ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ نارمل ہو رہا ہے اسے غصہ دلانے اور صدمہ پہنچانے والی باتیں نہ کی جائیں۔ میں اسے یہ خطوط بھی نہیں دکھا سکتی۔ اسے برے بھی نہیں کہہ سکتی۔ میں کیا کروں۔ کیا میں بھی پاگل ہو جاؤں؟"

"خدا نہ کرے کہ آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہو۔ یہ تو خاندانی دشمنی کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ آپ دونوں بھائیوں نے اپنے نازک موقع پر صبر اور دانشمندی سے کام نہ لیا تو ایک طرف ہمارا بیٹا پھر سے پاگل ہو جائے گا اور شاہدہ مفت میں بدنام ہوتی رہے گی۔"

"آپ ہماری شاہدہ کی فکر نہ کریں۔ اس کے نصیب میں جو ہوگا وہ بھگت لے گی۔ آپ مہربانی کرکے گفتگو کا موضوع بدل دیں یا یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے اپنے والدین کو کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر غصہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ میرے پاس آتے تھے اور جھوٹی تسلیاں دیتے تھے کہ ابھی شاہدہ کو رشتے کے لئے راضی کیا جا رہا ہے۔ پھر چاچی اور چاچا یہ کہتے ہیں کہ سلمان جب دماغی طور پر بالکل نارمل ہو جائے گا تو رشتے کی بات آگے بڑھائی جائے گی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ پرسکون اور نارمل رکھنے کے لئے ایسی باتیں کرتے رہتے تھے۔

صرف چھ ماہ گزر گئے یعنی ایک برس تک جاری رہنے والے علاج سے میں بالکل نارمل اور صحت مند ہو گیا تھا۔ اُدھر چاچا کسی دوسری جگہ شاہدہ کا رشتہ طے کر رہے تھے۔ ابّا نے کہا۔ "دیکھو، میرے بیٹے سے دشمنی نہ کرو۔ اسے نئی زندگی ملی ہے۔ مجھ سے بھرا پیمانہ نہ چھینو۔ شاہدہ صرف میرے گھر آئے گی۔"

"بھائی جان! یہ میری زندگی میں نہیں ہوگا۔"

"پھر میرے بیٹے کی زندگی میں شاہدہ کسی اور کی دلہن نہیں بن سکے گی۔"

"کیا آپ دھمکی دے رہے ہیں؟"

"آج دھمکی ہے کل دھماکہ ہوگا۔"

"اچھی بات ہے۔ آج سے بڑے بھائی کا احترام ختم سمجھیں۔ کوئی دھماکہ ہوا تو منہ توڑ جواب دوں گا۔"

چاچا دوسرے دن شاہدہ کے ہونے والے سسرال گئے تو وہاں چند بزرگوں نے کہا۔ "بھائی صاحب! آپ کچھ زیادہ ہی چالاک بن رہے ہیں۔ کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ بیٹی کی شادی اپنا خاندان چھوڑ کر ہمارے خاندان میں کیوں کر رہے ہیں؟"

چاچا نے کہا۔ "اس لئے کہ آپ کا لڑکا ہمیں پسند ہے۔"

"لیکن آپ کی لڑکی ہمیں پسند نہیں ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے ہم میں کیا عیب دیکھا ہے؟"

"کوئی عیب ہے تب ہی آپ کے خاندان میں اسے کسی نے بہو نہیں بنایا ہے۔ اب ہماری زبان نہ کھلواؤ۔ ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔"

چاچا وہاں سے سر جھکا کر چلے آئے۔ ایک نیک سیرت بیٹی کی بدنامی سے دل کٹ رہا تھا۔ انہوں نے خاندان کے بزرگوں کو بلایا اور کہا "بھائی جان اس خاندان کی ایک عزت دار بیٹی کو دوسرے خاندانوں میں جا کر بدنام کر رہے ہیں۔ اُن کی یہ حرکت صرف میرے لئے نہیں آپ سب کے لئے بھی ندامت کا باعث ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا "درست کہتے ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں کی بدنامیوں سے اونچے خاندانوں کی عظمت اور وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ دانشمندی یہی ہے کہ شاہدہ کی بدنامی کو یہیں روک دیا جائے اور اپنے ہی خاندان میں اس کی شادی کر دی جائے۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "وہ سلمان کے ساتھ بدنام ہو رہی ہے۔ سلمان ہی اس کے سر کی چادر بن سکتا ہے اور اس کی پارسائی کا بھرم رکھ سکتا ہے۔"

چاچا نے کہا "میں بھائی جان کی بدذاتی اور ذلالتیں بیان کر رہا ہوں اور آپ لوگ اُن کی ہی حمایت میں بول رہے ہیں؟"

ایک اور بزرگ نے کہا "اگر ہمیں جہاں دیدہ سمجھ کر فیصلہ کرنے بلایا ہے تو فیصلہ یہی ہے۔ دوسرے خاندانوں میں بیٹی کا رشتہ کرنے اور بدنامی کو دور تک پھیلانے سے صرف تمہاری نہیں ہم سب کی ذلت اور رسوائی ہے۔"

ایک اور بزرگ نے کہا "تمہیں اپنے بھائی جان کا احسان

ماننا چاہئے کہ شادی سے پہلے رسوا ہونے والی کو وہ بہو بنا رہا ہے۔ اس شادی کے بعد کوئی تمہاری بیٹی کی طرف انگلی اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کرے گا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے سب سے معمر بزرگ نے کہا "خاندان کے تمام بزرگوں نے متفقہ فیصلہ سنایا ہے۔ اگر تم نے فیصلہ تسلیم نہ کیا تو ہم دیکھیں گے کہ بیٹی کا بیاہ کہاں کرو گے۔ ہمارے بیچ کی شاہدہ خاندان پر کیچڑ اچھالنے کے لئے دوسرے گھر نہیں جائے گی۔"

چاچا وہاں سے سر جھکا کر چاچی کے پاس آئے۔ اُن کے پیچھے کھڑی ہوئی شاہدہ نے کہا "ابّا! آپ دونوں سگے بھائی ہیں۔ آپ کی بدقسمتی یہ ہے کہ آپ بیٹی کے باپ ہیں۔ آپ کو تو ہارنا ہی پڑے گا۔"

چاچا راضی ہو گئے۔ امی نے آکر مجھے خوشخبری سنائی۔ ڈاکٹر نے سنا تو اس نے مبارکباد دی۔ ابّا سے کہا "آپ کے بیٹے کا یہی ایک علاج تھا۔ آپ لوگ دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔"

ابّا اس معاملے میں دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگلے مہینے کو برات لے کر بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ چاچا نے کہا تھا "شادی کی رات شاہدہ رخصت ہو کر محلے والی حویلی میں نہیں جائے گی۔ دلہا دلہن اسی کوٹھی میں رہیں گے۔ دوسری صبح رخصتی ہوگی۔" اور شاہدہ نے اپنی ماں سے کہا تھا۔ نکاح کے بعد وہ میرے ساتھ تنہا اس کوٹھی میں رہے گی۔ تمام براتی اور میکے والے دوسری کوٹھی میں رات گزاریں گے۔ یوں بھی براتی تعداد میں صرف چودہ تھے۔ چونکہ ایک ہی خاندان تھا اس لئے وہ براتی بھی تھے اور شاہدہ کے میکے والے بھی۔ انہوں نے اسی محلے میں ایک دن اور ایک رات کے لئے کوٹھی حاصل کر لی تھی۔

نکاح پڑھاتے وقت بارش ہونے لگی تھی۔ اگر وہ شادی اطمینان اور سہولت سے ہوتی تو بارش کے موسم میں بھی نہ ہوتی مگر سچائی کی آنکھ سے دیکھا جائے تو وہ زبردستی کی شادی محض میرے علاج کے لئے ہو رہی تھی۔ اس لئے کسی بھی موسم میں اور کسی حالت میں ہو سکتی تھی لہٰذا وہ ہو رہی تھی۔

میں بہت خوش تھا۔ میری زندگی کے اندھیروں میں آسیب بن کر آنے والی حقیقت بن کر آرہی تھی۔ نکاح کے بعد کھانے کا انتظام دوسری کوٹھی میں تھا۔ چند عورتوں نے میکے میں ہونے والی دلہن کی رسومات ادا کیں۔ پھر وہ دلہن کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں پہلے میں رہا کرتا تھا۔ پھر وہ واپس آگئیں۔ امی اور چاچی نے مجھے دعائیں دیں۔ میں ان کے ساتھ کوٹھی کے باہر برآمدے تک آیا۔ جب وہ دوسری کوٹھی کی طرف جانے لگیں تو پھر بارش ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا انہیں رک جانے کو کہوں لیکن زبان نہیں کھلی۔ آج وہاں کسی کی موجودگی گوارا نہیں تھی۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں برآمدے سے گزر کر اندر گیا۔ صدر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر راہداری میں چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر آگیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے بستر کی طرف دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ دلہن کی سیج سونی تھی۔

میرے اندر بے چینی سی پھڑپھڑانے لگی۔ وہ ہاتھ آتے آتے نکل جاتی تھی۔ میں نے آواز دی۔ "شاہدہ!"

باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے واش بیسن میں پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی پھر باتھ روم کے قریب آکر کہا۔ "شاہدہ! خیریت تو ہے۔ تم نے دروازہ کھلا رکھا ہے اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ کیا میرے لئے آؤں؟"

اندر خاموشی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "ابھی مذاق کر رہا تھا۔ اندر نہیں آؤں گا۔ یہاں انتظار کر رہا ہوں۔"

میں مستی میں جھومتا ہوا بستر پر آکر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس بستر پر میں پچھلے دو برس تک تنہا سوتا رہا تھا اور سہانے سپنوں کو بلانے میں ناکام ہوتا رہا تھا۔ آج اسی کے لئے بستر پر پھولوں کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے دستک سنائی دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دستک نہیں تھی۔ کھٹکا سا ہوا تھا۔ کوٹھی کے تمام دروازے اندر سے بند تھے پھر راہداری میں کون ہو سکتا تھا؟

میں نے بستر سے اٹھ کر دروازے کے پاس آکر پوچھا "کون ہے؟"

جواب نہیں ملا۔ میں نے اندر کی چٹخنی گرا دی پھر دروازے کو کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ میں نے زور زور سے جھٹکا دیا۔ پتا چلا وہ باہر سے بند ہے۔ میں ابھی اسی دروازے سے اندر آیا تھا۔ اسے باہر کی طرف سے کھلا ہونا چاہئے تھا۔ پھر کیسے بند ہو گیا۔ میں نے چیخ کر پوچھا "باہر کون ہے؟ کس نے دروازہ بند کیا ہے؟"

جواب میں بجلی کی زوردار کڑک سنائی دی۔ میں وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا باتھ روم کے پاس گیا۔ پھر دروازے کو کھول دیا۔ واش بیسن کا نلکا کھلا ہوا تھا اور پانی بیسن میں گر رہا تھا۔ میں نے اندر آکر دیکھا وہ نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر آواز دی۔ "شاہدہ!"

جواب میں بادل گرجنے لگے۔ جب گرجنے کی آواز کچھ کم ہوئی تو دستک سنائی دی۔ میں باتھ روم سے نکل کر کمرے کے بند دروازے کی طرف جانے لگا۔ پھر دستک سن کر رک گیا۔ گھوم کر کھڑکی کی سمت دیکھا۔ پھر ایک بار [illegible] دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر آنگن میں کھلنے والی کھڑکی کے [illegible] دل دھڑکنے [illegible]

تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ آنگن میں [illegible] موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ تنگ پاجامے اور ململ کے کرتے میں بھیگ رہی تھی۔ اس کے بدن پر سہاگ کا سرخ جوڑا نہیں تھا۔ میں اسے جتنا چاہتا تھا وہ آنگن میں تھی۔ بھیگنے کا عجب سماں پیش کر رہی تھی۔ احساس میں

گڑگڑی پیدا کر رہی تھی۔ آج سے ٹھیک ایک برس پہلے اسی بارش میں اسی صحن میں اس کا ایک اتفاق تھا۔ اس وقت بارش اور چاند کی بیداری کے خوف سے صحن میں نہیں گیا تھا۔ آج بھی نہیں جا سکتا تھا اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

میں نے بے چین ہو کر کہا۔ "آج میں صحن میں آ سکتا ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

وہ بولی "تم نے ایسی دلہن دیکھی یا سنی ہے جو پہلی رات سیج پر نہ ہو صحن کی بارش میں ہو؟"

"واقعی دیکھی نہ سنی۔ دروازہ کھولو۔ ہم دولہا دلہن یہ رات بارش میں منائیں گے۔"

وہ آنگن میں کبھی اُدھر جا رہی تھی۔ کبھی اِدھر آ رہی تھی۔ آنے جانے میں بدن لہریں لیتا تھا۔ زلفوں سے پانی مسلسل ٹپک رہا تھا اور گوری چادر پر پھسل رہا تھا۔ وہ پھسل کر صحن کے بیچے فرش پر ذرا دور تک گئی۔ فرش کے پانی میں لیٹی ہوئی جل پری لگ رہی تھی۔ ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں تمہاری دلہن ہوتی تو سیج پر ہوتی۔ ایک نامحرم ہوں۔ اسی لیے ہمارے درمیان بند دروازے کی دیوار ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تم نامحرم نہیں ہو میری منکوحہ ہو۔ ہمارا نکاح پڑھایا گیا ہے۔"

"تم نے اور تمہارے باپ نے مجھے ہر پہلو سے گھیر کر تنہائی کے عذاب میں مبتلا کر کے اسی طرح منکوحہ کے بستر پر پہنچانا چاہا ہے جس طرح چند اوباش مجبور لڑکی کو زبردستی ہوس کے بستر پر لاتے ہیں۔"

بجلی کڑکتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی آسمان کے ایک طرف سے دوسری طرف چلی گئی۔

اس نے پوچھا۔ "بولو۔ کسی کو مجبور کر کے نکاح قبول کرانے سے نامحرم محرم ہو جاتی ہے؟ یہ کس مذہب میں ہے کہ جب خنجر کھا کر بھی کسی کو بستر پر نہ لا سکو تو زہر کھا کر بھی ایک شریف زادی کو مجبور نہ کر سکو۔ تنہائی میں کلام پاک کو درمیان دیکھ کر شیطانی ارادے میں کامیاب نہ ہو سکو تو سماج اور برادری کے ٹھیکیداروں سے آبرو لوٹنے کا نکاح نامہ حاصل کر لو۔ کل میری لاش دیکھ کر تمہیں اور تمہارے باپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے نکاح نہیں ہوتا بلکہ کسی بے بس کے جذبات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

بادل گرجتے گئے۔ تائید میں ہاں ہاں کہتے گئے۔

وہ بول رہی تھی مگر بہت کم سنائی دے رہی تھی۔ جب بجلی کڑکتی ہوتی تو صرف نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے کھڑکی کی جالیوں سے دونوں بازو اس کی طرف بڑھائے۔ گڑگڑا کر کہا۔ "مجھے آنے دو۔ میرے دماغ میں جہنم دہک رہا ہے۔ میں کھڑکی توڑ ڈالوں گا۔ اپنا سر پھوڑ لوں گا۔"

"اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہوتا تو میں دروازہ کھول کر تمہارے پاس آ جاتی مگر ایک بے دین اور بے ایمان کے پاس نہیں آؤں گی۔ تم نے مقدس کتاب کا احترام نہیں کیا۔ ایمان والے ہوتے تو دنیا سے کہتے 'تمہاری دلہن کلام الٰہی کے سامنے میں باوضو آئی اور باوضو گئی۔' اگر صرف میری توہین ہوتی تو میں برداشت کر لیتی لیکن تم نے کلام الٰہی کی ہتک کی ہے۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

میں نے گڑگڑاتے ہوئے کھڑکی کی آہنی جالیوں پر سر مارتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم مجھے پاگل بنا رہی ہو۔ میں پاگل نہیں بن سکتا۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

میری پیشانی آہنی جالیوں سے لہولہان ہو رہی تھی۔ اس نے کہا "تم پاگل ہو اور پاگل رہو گے۔ تم نے مجھے بدکار ثابت کیا۔ میں تمہیں پاگل ثابت کروں گی۔ تم میرا یہ بدن کبھی حاصل نہیں کر سکو گے۔"

میں نے حلق پھاڑ کر پوچھا "تم کب تک بچتی رہو گی۔ یہ دروازہ کب تک بند رہے گا؟"

اس نے گریبان سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی پھر کہا "اگر ہمارا نکاح جائز ہے تو بیوی کے مرتے ہی شوہر نامحرم ہو جاتا ہے۔ پھر مرحومہ کو چھونا تو دور کی بات ہے اس کی صورت بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ صبح جب دروازہ کھلے گا تو دنیا والے موجود رہیں گے۔ ان کی موجودگی میں تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔"

اس نے شیشی کھول کر منہ سے لگالی۔ میں آہنی جالیوں کو جھنجھوڑنے لگا۔ سر ٹکرانے لگا۔ وہ تمام زہر حلق سے اتارنے کے بعد زور سے چیخ کر بولی۔

سوال: "چچا کی بیٹی کو کیا کہتے ہیں؟"

جواب: "بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن کہتے ہیں۔"

اور کزن نامحرم ہوتی ہے۔ میں کل بھی ناقابل حصول تھی، مرنے کے بعد بھی رہوں گی۔"

وہ پانی سے بھرے ہوئے صحن کے فرش پر گر پڑی۔ میں دوڑتا ہوا دروازے کے پاس گیا۔ اسے جھنجھوڑنے لگا۔ وہ کھل نہیں سکتا تھا۔ اسے ٹکریں مارنے لگا۔ وہ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ میں فرش پر پچھاڑیں کھانے لگا مگر مر نہیں سکتا تھا۔ نہ یہ ہو سکتا تھا نہ وہ ہو سکتا تھا۔ میں نے آخری بار کزن کو پکارنے کے لیے چیخ ماری پھر بے ہوش ہو گیا۔

پتا نہیں کتنے مہینے کتنے برس گزر گئے ہیں۔ میں زندہ ہوں مگر زندوں میں نہیں ہوں۔

کبھی نارمل رہتا ہوں تو یہ دنیا سمجھ میں آتی ہے۔ کبھی ابنارمل ہوتا ہوں تو ایک عالم نامعلوم میں رہتا ہوں۔ اور قبر کو بھی تو عالم نامعلوم کہا جاتا ہے۔ یوں میرے قبر میں آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔